

کوئی نقصان نہ ہو۔ عجیب کمال شخص تھے مولوی خضر الدین..... کچھ ہی دیر میں مجھ سے یوں گھل مل گئے جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ میں نے یہ بات بھی محسوس کی کہ نہ صرف ساحل پر، بلکہ علاقے کے تقریباً سبھی لوگ ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور اگر وہ ذرا سا بھی اشارہ کر دیتے تو لوگ بنا کسی مول تول ہی کے، سارا کار سارا بازار ان کے قدموں میں لا ڈالتے، لیکن انہوں نے بچے کا رو بار یوں کی طرح ایک ایک پیہی پر لمبی بحث کی اور مال خرید کر میرے حوالے کر دیا۔ واپسی پر انہوں نے تفصیل سے مجھے مالائیں بنانے کا ہنر بھی سکھادیا کہ کس طرح پیہی کو ایک خاص زاویے سے دھاگے میں پرونا ہے..... ہم دونوں جب اپنی ”خریداری“ کے بعد اوپر درگاہ تک پہنچے، ظہر کی نماز کا وقت قریب آ چکا تھا، جب کہ مجھے ابھی اپنے دو پہر کے کھانے کا انتظام بھی کرنا تھا۔ عبداللہ نے اپنے حجرے کے چھوٹے سے باورچی خانے میں ضرورت کے چار برتن اور کچھ راشن میرے لیے چھوڑ دیا تھا، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ مجھے تو ٹھیک سے انڈا ابلنا بھی نہیں آتا تھا۔ یہاں بھی مولوں خضر ہی میرے کام آئے اور انہوں نے خود میرے کمرے میں آ کر تھوڑی سی دال کے ساتھ کچھ چاول ابال کر میرے ”لنچ“ اور ”ڈنر“ کا انتظام کیا۔

ابھی چوبیس گھنٹے پہلے ہی کی بات تھی، جب میں دو پہر کے ٹھیک اسی لمحے اپنے سارے دوستوں کیساتھ پرل کانٹی نینٹل میں ان کی طرف سے دیا گیا الوداعی ظہرانہ تناول کر رہا تھا۔ یہ لنچ دراصل کاشف کی طرف سے میرے اعزاز میں دیا گیا تھا اور ان سب نے مجھے گلے لگا کر اس دعا کے ساتھ رخصت کیا تھا کہ میں ایک آدھ ہفتے میں سلطان بابا سے اپنی ”شرط“ جیت کر واپس انہیں جوائن کر لوں گا۔ ہم سب کے لیے یہ ”درگاہ یا ترا“ صرف ایک شرط ہی تو تھی اور میں اس سے پہلے بھی ایسی کئی شرطیں جیت چکا تھا، لیکن یہ میری زندگی کی شاید سب سے مشکل کسوٹی تھی۔ اگر میرے دوست، یا والدین مجھے اس روز وہ سادہ سے دال چاول کھاتے دیکھ لیتے تو شاید حیرت اور صدمے سے بے ہوش ہو جاتے، البتہ اپنی استقامت پر تو خود مجھے بھی حیرت ہو رہی تھی کہ میں کس آسانی سے اس ماحول میں ڈھلتا جا رہا تھا۔

دن ڈھلا اور پھر سے وہی تنہا اور اداس شام درگاہ کی دیواروں پر اتر آئی۔ ایک ہی دن میں میری زندگی کس قدر بدل چکی تھی۔ عام حالات میں، میں اس وقت سو کر اٹھتا تھا اور نیم گرم پانی کا شاور لینے کے بعد تیار ہو کر کلب، ہوٹل، یا کسی دوست کی پارٹی میں محفل جیتی تھی، جس کا خاتمہ عموماً آدھی رات کے بعد ہی ہوتا تھا اور ہم اس وقت اپنے گھروں کو سونے کے لیے لوٹتے تھے، جب باقی لوگ جاگ کر اپنے کام کاج پر نکل رہے ہوتے تھے۔ اچانک سمندر کی طرف سے چلنے والی ہوا میں کچھ شور اور ہلے گلے کی مدھم سی آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ میں نے چونک کر دور نیچے ساحل پر نظر ڈالی، کچھ نوجوان لڑکے، لڑکیوں کا ایک گروپ ساحل پر رات گزارنے کے لیے کیمپ فائز کر رہا تھا۔ ساحل پر آگ جلا کر اور بڑے بڑے اسپیکر زپر موسیقی کی دھن پر رقص جاری تھا۔ خوشی تھی، ہنسی تھی، قہقہے تھے اور مستی تھی۔ میں بہت دیر تک دور نیچے ساحل پر اس گروپ کو دیکھتا رہا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ میرے ہی دوستوں کا گروپ ہو۔ ہم بھی تو ایسے ہی راتوں کو موج مستی کرنے نکل جاتے تھے۔ اچانک میوزک کی بیٹ بدل گئی اور ہوا میں نئے نئے کی آواز گونجی۔ لڑکے، لڑکیاں خوشی سے چلائے ”پرانی جینز اور گٹار.....“ لڑکیاں، لڑکے دیوانہ وار ناچ رہے تھے.....

لڑکپن کا..... وہ پہلا پیار.....

وہ لکھنا ہاتھوں پہ..... اے پلس آر (A + R)

وہ دینا تجھے میں..... سونے کی بالیاں
وہ لینا دوستوں سے پیسے ادھار.....

دفعہ مجھے اپنے گالوں پر کچھ نمی کا سا احساس ہوا۔ میں نے چونک کر ہاتھ پھیرا تو میری انگلیوں کی پوریں، خود میرے اپنے آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ میں نہ جانے کب سے رو رہا تھا۔ ٹھیک ہی تو ہے ”بس یادیں اور کچھ چھوٹی چھوٹی باتیں ہی تو رہ جاتی ہیں“ اور یادوں کے اسی کڑوے دھوئیں نے میرے حلق میں کانٹوں کا وہ جنگل اُگایا کہ پھر میرے آنسوؤں کے نہر کے۔ مجھے یاد آیا کہ یہ گانا یعنی کو بہت پسند تھا اور ہم کالج کینٹین میں گھنٹوں میز پر بجا بجا کر یہ گانا گایا کرتے تھے۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی یونہی رواں تھی کہ اچانک مجھے اپنے کاندھے پر کسی نرم ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔



We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers

If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com

**or
send message at
0336-5557121**

خضر راہ

میں چونک کر پلانا تو مولوی خضر میرے پیچھے کھڑے تھے۔ میں نے جلدی سے آنکھیں پونچھ ڈالیں، لیکن شاید وہ اس اندھیرے میں بھی میری بھیگی پلکوں کی تحریر پڑھ چکے تھے۔ ”لگتا ہے کچھ یاد آ گیا تمہیں.....“ میں نے جلدی سے بات بنائی ”نہیں..... وہ نیچے کچھ نو جوان پارٹی کر رہے ہیں..... شاید ان کے باربی کیو کے دھوئیں سے آنکھیں جلنے لگی تھیں.....“ مولوی خضر دھیرے سے مسکائے ”ہاں میاں..... دھواں لکڑی کا ہو، یا پھر یادوں کا..... دونوں صورتوں میں آنکھ تو جلتی ہے۔“ میں نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔ لیکن وہ جہاں دیدہ شخص تھے، بات بدل کر بولے۔ ””کل صبح ساحل کے بازار اکتھے چلیں گے، مجھے بھی کچھ راشن خریدنا ہے۔ ویسے تم نے آج کتنی سپیاں پروئیں.....“ ”جی سات مالائیں ہی پرو پایا ہوں اب تک۔“ انہوں نے خوش ہو کر میرے سر پر ہاتھ پھیر کر وعادی۔ ”شاباش..... تم واقعی ایک مخنتی اور اپنی دھن کے پکے لڑکے ہو..... مجھے یقین ہے، تم زندگی کے ہر میدان میں سرخرو ہو گے۔“ میں زندگی میں کبھی کسی کے سامنے نہیں رویا، لیکن نہ جانے ان کی اس دعا میں اور اس لمحے میں کیسا اثر تھا کہ میرا پہلے ہی سے بھرا دل چھلک پڑا اور میری آنکھیں پھر سے بہہ نکلیں۔ مولوی خضر الدین نے میرا کاندھا تھپتھپایا اور مجھے تسلی دے کر بولے۔ ”یہ آنسو بھی تمہارا چچا ہر کرتے ہیں، کیوں کہ جن کے دل میں کھوٹ ہوتا ہے، ان کی آنکھوں کے کنوئیں سدا خشک ہی رہتے ہیں..... لیکن میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا..... یہ آنسو کسی کی بھی زندگی کا رخ بدل سکتے ہیں، اس لیے انہیں ہمیشہ اپنی طاقت بنائے رکھنا، کبھی اپنی کمزوری نہ بنانا..... کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ تم کمزور نہیں ہو.....“ مولوی خضر میری ہمت بڑھا کر واپس پلٹ گئے۔

درگاہ میں میری دوسری رات بھی اسی بے چینی، بے کسی اور درد کی تڑپ میں گزر گئی۔ اگلے دن پھر سے وہی سارا معمول جاری رہا اور مولوی خضر میری راہ کے خضر بنے، مجھے راستہ دکھاتے اور سہارا دیتے رہے۔ سچ ہے کہ اگر ان ابتدائی دنوں میں مجھے ان کا ساتھ حاصل نہ ہوتا تو شاید میرے لیے درگاہ کی اس سادہ، مگر میرے لیے انتہائی سخت، زندگی کے معمول میں ڈھلنا اتنا آسان نہ ہوتا۔

اسی طرح تین دن بیت گئے اور جمعرات کا دن بھی آپہنچا۔ جمعرات کو تمام زائرین درگاہ کی زیارت کے لیے آتے تھے۔ نہ جانے کیوں صبح ہی سے میرا دل ہر آہٹ پر چونکنے اور ہر سرگوشی پر بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ یہی تو وہ دن تھا، جب وہ نسیم سحر، اس درگاہ کے فرش پر اپنے گلاب قدموں کا بوسہ دیتی تھی۔ سہ پہر تک تو میری گھبراہٹ اس قدر بڑھ چکی تھی کہ مجھے یوں لگنے لگا کہ جیسے میرا دل ابھی میرے سینے کا بنجرہ توڑ کر باہر آگرے گا اور پھر چار بجے کے قریب اچانک ہی وہ ٹھنڈی سی پروانی چلی، جو میری روح تک کو سرشار کر دیتی تھی۔ میں نے گھبرا کر نظریں اٹھائیں تو وہ ماہ رخ اسی شان سے چلتی ہوئی درگاہ کے صحن میں داخل ہو رہی تھی، ساتھ ہی حسب معمول اس کی ماں اور دو قدم پیچھے اس کی خادمہ بھی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی آرہی تھیں۔ اس نے درگاہ کے دروازے کے قریب صفائی کرتے زائر سے کچھ پوچھا، شاید عبداللہ کے بارے میں استفسار کیا ہو۔ زائر نے جواب میں میری طرف

انگلی اٹھا کر اشارہ کر دیا۔ میں اس وقت درگاہ کے مرکزی صحن میں دروازے سے بہت دور بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن جب زہرا نے پلٹ کر میری طرف دیکھا تو اتنی دور سے بھی اس کی حیرت آمیز نگاہوں کی تپش سے مجھے اپنا پورا وجود جھلکتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی مجھ پر نظر پڑی اور یہ میری تقدیر کی وہ پہلی نظر تھی، جس کا وقفہ شاید سب سے لمبا تھا۔ زہرا نے زندگی میں پہلی بار اتنی دیر تک میری جانب دیکھا تھا۔ شاید وہ حیرت اور صدمے کی وجہ سے اپنی نظر مجھ سے ہٹا نہیں پاتی تھی۔ لیکن میں نے اپنی زندگی کے ان چند لمحوں کو کچھ اس طرح جیا کہ پھر کسی اور سانس کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ گئی۔ کسی کے لیے فنا ہو جانے کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کے دل بر کی نگاہ اس پر لگی ہو اور وہ اپنی جان اس جان آفرین کے سپرد کر دے۔ کچھ دیر تک زہرا مجھے اور میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا اور اس نے اپنی نظریں جھکا لیں۔ مجھے یوں لگا جیسے بہت گھنی اور کالی گھٹا کے سائے کے بعد اچانک ہی بے حد تیز اور چمکن والی دھوپ نکل آئی ہو۔ زہرا کی ماں کی نظر بھی مجھ پر پڑی اور انہیں بھی اپنی بیٹی جیسا ہی شدید حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ تیز قدموں سے میری طرف کھینچی چلی آئیں۔ زہرا اور خادمہ اپنی جگہ پر کھڑے رہ گئے۔ انہوں نے آتے ہی میرے سلام کا جواب دیا اور جلدی سے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر میرے چہرے کو یوں ٹٹولا، جیسے وہ میرے ہونے کا یقین کرنا چاہتی ہوں۔ پھر بہت دیر بعد ان کے ہونٹوں سے کچھ ٹوٹے لفظ ادا ہوئے۔ ”ساحر بیٹا..... تم..... یہاں..... میرا مطلب ہے اپنا گھر بار چھوڑ کر اس طرح..... لیکن کیوں.....“ شاید انہیں خود بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔ میں نے انہیں اس صدمے سے نکالنے کے لیے خود ہی بات جوڑنے کی کوشش کی۔ ”جی..... میں نے سوچا کہ کچھ دن زندگی کا یہ رخ بھی دیکھ لیا جائے تو کیا حرج ہے، اور ہاں..... لوگ مجھے یہاں ’عبداللہ‘ کے نام سے جانتے ہیں۔ ساحر اب میرا پرانا نام ہے.....“ انجانے میں میرے منہ سے ایک ایسی بات نکل گئی جو انہیں کچھ دیر سے پتا چلتی تو بہتر ہوتا۔ میرے منہ سے میرا نام سن کر تو وہ جیسے بالکل ہی ڈھسے گئیں اور وہیں درگاہ کے صحن کے فرش پر بیٹھ گئیں۔ میں نے جلدی سے انہیں قریبی گھڑے سے پانی کا ایک گلاس نکال کر پیش کیا اور تسلی دی۔ ”آپ اپنے ذہن پر کوئی بوجھ نہ لیں۔ یہ راستہ میں نے خود اپنی مرضی سے اختیار کیا ہے، بنا کسی جبر کے..... بس آپ میرے لیے دعا کیجئے گا۔“

میں وہاں سے اٹھ کر اپنے حجرے کی جانب چلا آیا، کیونکہ کچھ دیر ہی میں نذر و نیاز کا سلسلہ شروع ہونے والا تھا۔ میں نے درگاہ کے معمول کے مطابق پہلے مردانے والے برآمدے کی جانب بیٹھ کر گزارنے جمع کر کے ان کی فہرست بنائی اور اسی وقت جمعرات کے دن خصوصی طور پر آئے ہوئے درگاہ کے چند خدمت گاروں کے ذریعے ان کی تقسیم کے احکامات بھی جاری کر دیئے۔ پھر میں حجرے میں بنی اس کھڑکی میں آ بیٹھا، جو درگاہ کے پچھلے برآمدے میں کھلتی تھی اور جمعرات کے دن خصوصی طور پر زنانے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ کچھ ہی دیر میں خواتین کی آمد بھی شروع ہو گئی، جو اپنی نذر اور صدقہ وغیرہ اس چھوٹی سی کھڑکی سے اندر بڑھا کر اپنے مختلف النوع و قسم کے مسائل کے حل کے لیے دعا کی درخواست کرتیں اور دعا کے بعد اٹھ کر یوں مطمئن ہو کر چلی جاتیں، جیسے اس دعا کے بعد واقعی ان کے سب مسائل ایک دم حل ہی تو ہو جائیں گے؟ اور پھر کچھ ہی دیر بعد اسی مترنم آواز نے دھیرے سے سلام کیا۔ وہی آواز جسے میں دنیا کی اربوں آوازوں میں بھی، بنا ایک بل ضائع کئے، شناخت کر سکتا تھا۔ میری آواز گلے میں اٹکنے سی لگی اور مجھ سے ٹھیک طرح سے جواب بھی نہیں دیا گیا۔ کچھ دیر دوسری جانب بھی خاموشی چھائی رہی پھر وہ دھیرے سے بولی۔ ”یہ آپ کیا کر رہے ہیں..... خدا کے لیے اپنی ضد چھوڑ دیں..... ایسے بھلا کون، کسی کے لیے اپنی زندگی برباد کرتا ہے.....؟“ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ وہ

مجھ سے مخاطب تھی، جس کی صرف ایک جھلک دیکھنے کے لیے میں نے اپنی زندگی تیاگ دی تھی۔ لیکن یہ جوگ مجھے اتنا بڑا انعام دے گا، یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ میں تو صرف اس کی آواز سننے کے لیے ایسے نہ جانے کتنے جنم، اس درگاہ پر تیاگنے کے لیے تیار تھا اور اسے صرف میری اسی ایک حقیر زندگی کی فکر لگی ہوئی تھی۔ میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر اس نے پھر بے چین ہو کر اپنی بات دہرائی۔ ”آپ چپ کیوں ہیں۔۔۔۔۔ بولتے کیوں نہیں۔۔۔۔۔؟“ میں اپنے خیالات کی رو سے چونکا۔ ”شاید کچھ لوگوں کے مقدر ہی میں برہادی ہوتی ہے۔ کچھ زندگی الٹی ہی تباہ ہو جانے کے لیے ہیں۔۔۔۔۔“ وہ بھڑک سی گئی۔ ”آپ صرف پتھروں سے سرکرا رہے ہیں۔۔۔۔۔ سوائے زخموں کے اور کچھ نہیں حاصل کر پائیں گے آپ۔۔۔۔۔“

”مجھے مرہم کی تمنا بھی نہیں ہے۔۔۔۔۔ پتھروں سے سرکرنے کا شوق ہی مجھے یہاں تک لے کر آیا ہے۔ لیکن کچھ پتھر شاید یہ نہیں جانتے کہ جس جبین کو وہ یوں لہو لہان کر رہے ہیں، اسی پیشانی سے چھلکتا خون، خود انہیں بھی تو داغ دار کر دے گا۔“ زہرا کو میری بات سن کر غصہ آ گیا۔ ”بات اگر داغ دار ہونے کی ہے تو اپنا دامن بھی کون سا اجلا ہے۔ ایک داغ اور سبھی۔۔۔۔۔ بہر حال۔۔۔۔۔ میں پھر بھی آپ سے یہی درخواست کروں گی کہ یہ پاگل پن چھوڑ دیں۔۔۔۔۔ یہ راہ پہلے ہی کئی زندگیاں برباد کر چکی ہے۔۔۔۔۔ میں نہیں چاہتی کہ ایک اور جیون اس کی بھیشت چڑھے۔۔۔۔۔ آگے آپ کی اپنی مرضی۔۔۔۔۔“ وہ وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ مجھے یاد نہیں، میں نے کس طرح اس کی خادمہ سے اس کا نذرانہ وصول کیا اور کس طرح باقی خواتین کے مسائل سنے۔ بس ایک خواب کی سی کیفیت میں سارا وقت گزر گیا۔ ہوش تب آیا، جب مولوی خضر کے پیچھے ہوئے ایک شخص نے آ کر اطلاع دی کہ مغرب کی اذان ہو رہی ہے اور مولوی صاحب مسجد میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے سارا سامان اور نقد رقم وغیرہ درگاہ کے خصوصی زائر کے حوالے کی اور خود مسجد چلا آیا۔ نماز کے بعد جب مسجد خالی ہو گئی تو مولوی خضر مجھے اپنے ساتھ لیے چہل قدمی کرنے نیچے ساحل کی جانب چلے آئے۔ ساحل اس وقت بالکل سناں پڑا تھا۔ مغرب کی جانب سے چلتی ٹھنڈی پروانی میں شامل نمی نے کچھ ہی دیر میں ہم دونوں کو بھگو دیا۔ انہوں نے شاید میری خاموشی کو محسوس کر لیا تھا، تبھی ہلکے سے کھنکھار کر بولے۔ ”کیوں میاں۔۔۔۔۔ آج کچھ کھوئے کھوئے سے لگتے ہو۔۔۔۔۔ سب خیر تو ہے نا۔۔۔۔۔“

”جی۔۔۔۔۔ کچھ خاص نہیں۔۔۔۔۔ بس یوں ہی کچھ سوچ رہا تھا۔۔۔۔۔“ اچھی بات ہے۔۔۔۔۔ انسان کو سوچتے رہنا چاہئے۔۔۔۔۔ ہماری دنیا میں آمد کا اصل مقصد بھی یہی سوچ اور یہی کھوج ہے۔۔۔۔۔ اور اسی کھوج اور اسی جستجو کا ہمیں حکم بھی دیا گیا۔۔۔۔۔“ نہ جانے آپ کس کھوج کا ذکر کر رہے ہیں، لیکن میری سوچ تو کافی خود غرضی ہے۔۔۔۔۔ میں اپنے ہی ایک مسئلے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔۔۔۔۔ جس کا فائدہ، یا نقصان صرف میری ذات تک محدود ہے۔۔۔۔۔“

مولوی خضر چلتے چلتے رک گئے اور انہوں نے اپنی انگلی کے اشارے سے میری توجہ دور سمندر میں کھڑے ایک بحری جہاز کی جانب مبذول کروائی۔ ”جانتے ہو۔۔۔۔۔ سمندر کے نیچوں بیچ کھڑا یہ دیوبیکل جہاز بھی کسی انسان کی ایسی ہی سوچ کا نتیجہ ہے، جو ہو سکتا ہے کہ شروع میں اسے بھی صرف اپنی ایک خود غرضانہ سوچ لگی ہو۔۔۔۔۔“ میں سمجھا نہیں۔۔۔۔۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔“ مولوی صاحب نے غور سے میری جانب دیکھا ”دنیا کی ہر ایجاد، تبدیلی اور ترقی کسی سوچ ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔۔۔۔۔ ہاں البتہ کوشش اور لگن کا جنون شرط آخر ہے۔۔۔۔۔ انسان سوچتا ہے پھر کوشش کرتا ہے اور پھر پروا لا چاہے تو اس کی سوچ کو الہام بنا دیتا ہے۔ انسان کے ذہن میں وہ کلیہ ڈال دیتا ہے، جو آگے چل کر اس کی، اس بحری جہاز جیسی ہی کسی کامیابی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔۔۔۔۔ لہذا سوچ کس قدر ضروری ہے۔۔۔۔۔ اس کا اندازہ اب تم خود ہی لگا لو۔۔۔۔۔“ ان کی باتیں سن کر میں چونک سا گیا۔ ”گو یا آپ یہ کہنا

چاہتے ہیں کہ یہ بحری جہاز، یا پھر اس جیسی اور کبھی ایجادیں انسان کو اپنی کوشش کی نہیں..... بلکہ کسی الہام کی مرہون منت ہیں.....؟“ وہ میری طرف دیکھ کر ہلکا سا مسکرائے..... ”کافی ذہین ہو..... میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ بھرپور کوشش اور شدید محنت کے بعد ملنے والی کامیابی بھی کسی ایسے اشارے کے تابع ہوتی ہے، جو قدرت انسان کے ذہن میں ڈال دیتی ہے۔ بات لمبی ہو جائے گی..... چلو عشاء کا وقت ہو رہا ہے..... ہم نماز کے بعد اس موضوع پر بات کریں گے.....“

ہم دونوں واپس درگاہ کی جانب پلٹ گئے۔ عشاء کی نماز کے بعد جب سب نمازی مسجد سے نکل گئے تو مولوی خضر میری جانب متوجہ ہوئے۔ ”ہاں تو میاں..... میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ قدرت نے انسان کو کھوج کے لیے ہی دنیا میں بھیجا ہے اور جو بھی اس سوچ و بچار اور کھوج پر محنت کرتا ہے، قدرت اسے کامیابی کا پھل دیتی ہے۔ پھر چاہے وہ ایمان والا ہو، یا پھر کوئی کافر..... اس سوچ و بچار اور تحقیق کے انعام میں قدرت نے کوئی تخصیص نہیں برتی..... اور اس کی مثال تمہارے سامنے ہی ہے کہ گزشتہ کئی صدیوں سے مسلمانوں کی کوئی قابل ذکر ایجاد سامنے نہیں آئی، جب کہ غیر مسلم اس تحقیق اور ایجاد کے میدان میں ہم مسلمانوں سے کہیں زیادہ آگے نکل چکے ہیں۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ چاہے مسلم ہو، یا غیر مسلم شدید محنت کے بعد کامیابی کا یہ فارمولا قدرت کسی الہام ہی سے ان کے ذہنوں میں منتقل کرتی ہے، جسے ہم کمزور انسان اپنی محنت کا ثمر جان کر فخر سے اتراتے پھرتے ہیں۔ اس کے لیے ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں تمہیں۔ کیا نام تھا اس سائنس دان کا..... ہاں نیوٹن..... کیا تم سمجھتے ہو کہ اسے خاص اس لمحے، جب وہ سیب گرنے والا تھا، اس درخت کے نیچے از خود پہنچ جانا چاہئے تھا.....؟ اور کیا اس کے ذہن میں یہ خیال خود اپنے طور پر ہی آ گیا ہوگا کہ یہ سیب زمین کی طرف کیوں آیا.....؟..... اور پھر یہی خیال اس کے آس پاس کے لوگوں، یا پھر اس سے پہلے کسی اور کے ذہن میں کیوں نہیں آیا؟ اور اگر کبھی آیا بھی تھا تو اس نے اس عمل کی جستجو کیوں نہیں کی؟ کیا یہ سب باتیں اسے نیوٹن کا الہام ثابت نہیں کرتیں..... اور پھر صرف کشش ثقل ہی کی کیا بات ہے..... رائٹ برادران کے اڑنے کے خواب سے لے کر نیل آرم اسٹراٹگ کے چاند پر قدم رکھنے تک کا ہر خواب بھی تو ایک الہام ہی تھا، جو کسی نہ کسی خواب، یا سوچ کے ذریعے قدرت نے ان کے دلوں میں ڈال دیا تھا۔“ مولوی خضر بولتے چلے گئے اور میں حیرت کے عالم میں ساکت سا بیٹھا، ان کی باتیں سن رہا۔ سائنس میں نے بھی پڑھی تھی، لیکن سائنس کے بارے میں اس قدر تازہ نظریہ میں نے آج تک نہیں سنا تھا۔ وہ چپ ہوئے تو میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ ”آپ کا نام مولوی خضر الدین کے بجائے پروفیسر خضر ہونا چاہئے تھا.....؟“ میرے اچانک ریماکس سن کر وہ دھیرے سے ہنس پڑھے..... ”ضروری نہیں ہوتا کہ علم صرف کتابوں، یا یونیورسٹی ہی سے حاصل کیا جائے..... ایک سچے طالب علم کے لیے ساری دنیا ہی ایک درس گاہ ہے..... ویسے کہنے کو میں نے بھی برائے نام کچھ عرصہ فزکس کی ڈگری لینے کے بعد پروفیسر شپ کی ہے، ایک بڑی یونیورسٹی میں..... لیکن سب رائیگاں ہی گیا.....“ میں اپنی جگہ سن سا بیٹھا رہ گیا۔ میں جب سے درگاہ کی اس نئی دنیا میں آیا تھا، قدم قدم پر مجھے ایسی ایسی حیرتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا کہ اب تک تو مجھے ان جھٹکوں کا عادی ہو جانا چاہئے تھا۔ لیکن مولوی خضر بھی ایک ایسے ہی صاحب کمال شخص نکلیں گے، یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ آخر میرے ہونٹوں پر وہ سوال آ ہی گیا، چونہ جانے کتنے دنوں سے میرے دل و دماغ میں کچل رہا تھا۔ ”آج آپ مجھے بتا دیں کہ آپ سب کس گمری سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہلے عبداللہ، پھر سلطان بابا اور اب آپ، ایسے اور کتنے لوگ موجود ہیں،

میرے آس پاس۔ ان طلسمات کی کوئی حد بھی ہے، یا نہیں آخر یہ کون سی دنیا ہے.....؟“ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم سب بھی اسی نگری کے ہیں، جہاں تم بستے ہو۔ بس ہم نے راستہ ذرا مختلف اختیار کیا ہے۔ منزل ہماری بھی وہی ہے، جو باقی سب کی ہے۔“ لیکن کوئی تو بات ہوگی، جو آپ سب اتنا پڑھنے کے بعد اپنی اپنی فیلڈز چھوڑ کر اس راستے پر نکل پڑے ہیں.....؟ کوئی تو کشش ہوگی اس دنیا کی؟“ کشش صرف تحقیق اور جستجو کی ہے۔ آخر ہمیں دنیا میں بھیجے جانے کا مقصد صرف روزگار کمانا اور بچے پیدا کرنا تو نہیں ہو سکتا نا۔ لیکن افسوس کہ ہم انہی جھمیلوں میں پڑ کر اپنا سارا جیون ضائع کر دیتے ہیں۔ ہماری اس ظاہری دنیا کے آس پاس اور بھی ایسے کئی جہاں ہیں، جنہیں کھوجنے کی ضرورت ہے۔ ہم غیروں پر تکیہ کئے ہی کیوں بیٹھے ہیں، جب کہ یہ سارا علم تو مومن کی معراج ہے.....؟“

مولوی خضر رات گئے تک مجھے تحقیق اور جستجو کی افادیت پر لیکچر دیتے رہے۔ مجھے ان کی سبھی باتیں سمجھ تو نہیں آئیں، لیکن ایک بات کا یقین پوری طرح ہو چکا تھا کہ ہمارے آس پاس ایک نظر نہ آنے والا غیر مرئی نظام بھی پوری طرح متحرک اور کار بند ہے جس کا دائرہ کار وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں ہمارا یہ ظاہری نظام ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اس ماورائی دنیا سے میرا پورا تعارف ہونا ابھی باقی تھا۔ میں رات بہت دیر سے مولوی خضر کے حجرے سے نکل کر ”درگاہ“ لوٹا۔ ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا، جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ میرا اپنے کمرے میں جا کر سونے کو من نہیں ہوا تو میں وہیں صحن میں ہاتھوں کا تکیہ بنا کر کچھ دیر کمر کمانے کے لیے لیٹ گیا، اور پھر رات کے نہ جانے کس پہر میری آنکھ ذرا سی لگی ہی تھی کہ اچانک مجھے اپنے آس پاس وہی ٹھنڈی سی پروائی چلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ہاں..... وہی سکون آمیزی ٹھنڈک کا احساس، جو ہر مرتبہ میرے سر پہ کو اس وقت گھیر لیتا تھا، جب کبھی میرا زہرا سے آنا سامنا ہوتا تھا۔ مجھے جیسے ہی اس احساس نے چھوا..... میں نے گھبرا کر جھٹ سے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ بیٹھا۔ کچھ دیر تو مجھے سمجھ ہی نہ آیا کہ ہوا کیا ہے، پھر ایک ہلکی سے آہٹ ہوئی اور میں نے چونک کر درگاہ کے دروازے کی جانب دیکھا۔ دروازے کے پتوں بیچ زہرا کھڑی تھی۔



من کی لگن

ہاں..... وہ زہرا تھی۔ پہلے پہل تو مجھے بھی یہ لگا کہ میں دیوانگی کی اس سطح تک پہنچ گیا ہوں جہاں انسان جاگتی آنکھوں سے بھی سنے دیکھنے لگتا ہے، لیکن جب میں نے زہرا کے پیچھے اس کی ماں اور ڈرائیور کو بھی دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھا تو مجھے اپنی نظروں پر یقین آ ہی گیا۔ لیکن وہ رات کے اس پہر، یہاں اس ویرانے میں کیا کر رہی تھی؟ اور رات بھی کہاں..... اب تو سحر قریب تھی۔ زہرا کی حالت کافی ابتر تھی۔ میں نے آج تک اسے پورے، یا آدھے نقاب کے بغیر گھر سے باہر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، لیکن آج اس کا مہتاب چہرہ بے نقاب تھا اور غزال آنکھوں تلے پڑے حلقے اس بات کی نشان دہی کر رہے تھے کہ وہ کئی دنوں سے نہیں سوئی۔ پر اس وقت وہ اس قدر پریشان نظر آ رہی تھی کہ میرے منہ سے گھبراہٹ میں صرف دو لفظ ہی نکل پائے۔ ”آپ..... یہاں.....؟“ زہرا سے پہلے اس کی والدہ بول اٹھیں۔ ”معاف کرنا بیٹا..... ہمیں اس وقت اس طرح یہاں نہیں آنا چاہئے تھا، لیکن وہ کہتے ہیں نا..... اولاد ضرور ہو..... پر اکلوتی نہ ہو..... بس اسی اکلوتی اولاد کے پیار کی وجہ سے ہم بھی یوں در در بھٹک رہے ہیں.....“ مجھے ان کی بات سمجھ میں نہیں آئی، لیکن میں نے اخلاقی فرض نبھایا۔ ”آپ حکم کریں..... میں کیا مدد کر سکتا ہوں.....“ اس بار بولنے میں زہرا نے پہل کی۔ اس کی نظریں جھکی جھکی اور پلکیں لرز رہی تھیں..... ”میں نے انہیں آس پاس کی تمام درگاہوں میں بہت تلاش کیا ہے..... لیکن ان کا کچھ پتا نہیں چلا..... کیا آپ مجھے ان کا پتا دے سکتے ہیں..... میں..... میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی.....“ زہرا نے بات ختم کر کے نگاہ اٹھائی۔ میں اس کے کانپتے لب دیکھ رہا تھا۔ ہماری نظریں ملیں اور میرے دل کا بچا کچھانکوں کا آشیانہ بھی ایک ہی پل میں جل کر خاکستر ہو گیا۔ عموماً شعراء نظر سے نظر کے رشتے کو بہت موضوع گفتگو بناتے ہیں، لیکن ”نظر سے نظر کی التجا“ کو جس قدر تفصیل سے اس وقت میں بیان کر سکتا تھا، شاید کوئی اور نہیں۔ اسے تقدیر کا ستم نہ کہیں تو اور کیا کہ صدیوں کے بعد محبوب در پر آیا بھی تو صرف رقیب کا پتا لینے..... سچ پوچھیں تو اس وقت مجھے عبداللہ کی قسمت پر بے حد رشک آیا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو کر بھی اس نازنین کے کتنے قریب تھا اور میں اس کی گھائل نگاہ کے سامنے ہوتے ہوئے بھی کس قدر اوجھل..... شاید وہ میری نظریں شکایت کو بھانپ گئی تھی، جیسی اس نے پھر سے پلکوں کا پردہ گرا دیا تھا۔ ابھی ایک دن پہلے ہی اتفاق سے مجھے عبداللہ کا پہلا خط ملا تھا، جو اس نے اپنی نئی منزل پر پہنچ کر مجھے لکھا تھا۔ عبداللہ اس وقت یہاں سے تقریباً تین سو کلومیٹر کی دوری پر کسی اور درگاہ میں تعینات تھا۔ کاش اس پر ی رخ نے مجھ سے میری جان مانگی ہوتی، پر مانگا بھی تو کیا.....؟ رقیب کا پتا..... بہر حال حکم کی تکمیل پھر بھی میرا فرض ہی ٹھہرا۔ ”آپ یہیں رکئے.....“ میں جلدی سے اپنے حجرے کی جانب بڑھ گیا۔ عبداللہ کا خط نکال کر ایک طرف رکھا اور لفافہ لا کر زہرا کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ”کل مجھے اس کا خط ملا..... لفافے کے پیچھے عبداللہ کا پتا موجود ہے.....“ زہرا کی بے چین انگلیوں نے کچھ ایسی تیزی سے لفافے کو ٹٹولا، جیسے شدید پیاس کے عالم میں مرتا ہوا کوئی شخص پانی کا آخری بچا ہوا گھونٹ پینے کے لیے پیالہ پکڑنے کی سعی کرتا ہے۔ اس کا بس چلتا تو شاید لفافے

پر لکھے حروف کو بھی نظر سے پی جاتی۔ اب کی بار اس نے نظریں اٹھائیں تو اس کی نگاہ میں پہلی مرتبہ میرے لیے کچھ نری اور ممنونیت سی تھی۔ ”میرے پاس الفاظ نہیں ہیں..... پھر بھی آپ کا بہت بہت شکریہ..... کاش میں اس قابل ہوتی کہ آپ کے احسان کا یہ قرض کسی بھی طور اتار پاتی.....“ زہرا بات ختم کر کے چل دی اور..... میں اس بھکاری کی طرح کھڑا رہ گیا، جس سے اس کی دن بھر کی بھیک بھی کوئی لٹییرا اچھین لے جائے۔ زہرا کی ماں نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر میری جانب پلٹ آئیں۔ ان کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ ”اگر زہرا کے لبا کسی کاروباری دورے پر ملک سے باہر نہ گئے ہوتے تو شاید اپنی بد نصیب بیٹی کی چاہت بھی مجھے یوں آدھی رات کو اپنی دہلیز پھلانگنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی، مگر بیٹا، وہ تو سوالی ہے..... اپنے دیوانے پن میں یہاں تک چلی آئی، تم نے اسے پتا کیوں دے دیا..... تم چھپا بھی تو سکتے تھے.....“ وہ کہتے کہتے چپ سی چوگیں، لیکن میں ان کا اشارہ سمجھ چکا تھا۔ ”ایک سوالی کسی دوسرے سوالی کی التجا بھلا کب ٹال سکتا ہے۔ ہم دونوں کی اذیت مشترک ہے۔ ہاں! فرق بس اتنا ہے کہ انہیں کوئی پتا نہ تھا، والا تو میسر ہے، جب کہ میری تقدیر اس معاملے میں بھی کھوٹی ہے.....“ وہ کچھ دیر تک میرے چہرے پر لکھی نہ جانے ضبط کی کون سی تحریر پڑھتی رہیں، پھر بولیں ”میرا اپنی دعاؤں سے بھر و سالاٹھے عرصہ ہو گیا ہے..... لیکن پھر بھی اگر کوئی ایک آخری دعا قدرت نے قبولیت کے لیے باقی رکھ چھوڑی ہے تو میں اسے تمہارے نام کرتی ہوں۔ کاش میرے نصیب میں تمہاری فرزندگی لکھی ہو..... جیتے رہو۔

ان کی آنکھیں چمک پڑیں اور پھر ان سے رکا نہیں گیا۔ میرے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دیتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ گئیں۔ زہرا ڈرائیور کے ساتھ پہلے ہی درگاہ سے نکل چکی تھی۔ میں اسی طرح تنہا، بے کس اور لاچار سا درگاہ کے صحن میں کھڑا رہ گیا۔ مجھے اپنے آس پاس ہزاروں آندھیوں کا شور محسوس ہو رہا تھا۔ نہ جانے لوگ دیوانوں پر ترس کیوں کھاتے ہیں۔ پاگل پن تو ایک نعمت ہے۔ بد نصیب تو مجھ جیسے ہوش والے ہوتے ہیں، جو ان اذیت ناک لحوں کا عذاب جھیلنے کے لیے ہوش و حواس میں رہتے ہیں۔

جب فجر کی اذانیں ختم ہوئیں، تب بھی میں وہیں اسی جگہ گم صم سا کھڑا تھا۔ اتنے میں مولوی خضر کا بیٹا میر بھی آ کر نماز کھڑی ہونے کی اطلاع دے کر جا چکا تھا۔ مولوی خضر نے میری ”تازہ تازہ“ نماز کی وجہ سے اپنا یہ معمول بتا کر کھا تھا کہ روز صبح احتیاطاً جگانے کے لیے کسی نہ کسی نمازی کو درگاہ بھیج دیتے تھے۔ اس دن میرا دل نماز پڑھنے پر بھی مائل نہیں تھا، لیکن جب تیسری مرتبہ مسجد سے میرا بلاوا آیا تو بادل غواستہ مسجد کی جانب چل پڑا۔ مولوی صاحب نے نماز ختم کی اور اپنا درس شروع کیا۔ ہاں تو بھی کل میں بتا رہا تھا کہ حضرت نوح علیہ السلام اپنے چند پیروکاروں کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ ایک نہایت ہی عمر رسیدہ بڑھیا دہائی دیتی ہوئی آ پہنچی۔ آپ علیہ السلام نے اس سے ماجرا دریافت کیا تو بڑھیا نے فریاد کی کہ ”یا حضرت..... میرے بچوں کے حق میں دعا فرمائیے..... وہ ڈھائی، تین سو سال کی کچی عمر ہی میں ہوتے ہیں کہ کسی نہ کسی بیماری کی وجہ سے انتقال کر جاتے ہیں..... آپ ان کی جوانی اور درازی عمر کے لیے دعا کیجئے.....“ حضرت نوح علیہ السلام بڑھیا کی فریاد سن کر مسکرا دیئے اور دعا کے لیے ہاتھ بلند کر کے بڑھیا کے حق میں دعا فرمادی۔ بڑھیا کے جانے کے بعد محفل میں سے کسی نے عرض کیا۔ ”یا حضرت نوح علیہ السلام..... جب اس بڑھیا نے آپ علیہ السلام سے دعا کی درخواست کی تو آپ علیہ السلام مسکرائے کیوں.....؟“ حضرت نوح علیہ السلام نے پھر تبسم فرمایا اور ارشاد فرمایا۔ ”یہ بڑھیا اپنے بچوں کی تین سو سال زندگی کو دراز کرنے کی دعا کی مثنیٰ تھی اور میں یہ سوچ کر مسکرا دیا کہ اگر میں اسے یہ بتا دیتا کہ ایک ایسا زمانہ بھی آئے گا

کہ جب انسان پچاس، ساٹھ سال کی عمر میں ہی نہ صرف بچپن، لڑکپن، نو جوانی، جوانی اور پھر بڑھاپے کی منزل پار کر کے طبعی موت مر بھی جائے گا تو کیا یہ اپنے بچوں کی عمر پر خداوند کریم کے آگے سجدہ شکر نہ بجالاتی.....؟“

ساری محفل انگشت بدنداں رہ گئی۔ کسی نے پوچھا۔ ”یا حضرت، کیا واقعی کوئی ایسا زمانہ بھی آئے گا، جب انسان اتنی مختصر عمر میں پیدائش کے بعد بوڑھا ہو کر مر جائے گا۔“ حضرت نوح علیہ السلام نے جواب دیا۔ ”ہاں..... قرب قیامت کے آس پاس ایک ایسا وقت بھی آئے گا، جب انسان پچاس ساٹھ سال کے مختصر عرصے میں پیدائش سے لے کر بڑھاپے اور پھر موت کے تمام مراحل طے کر لے گا۔“ ساری محفل بیک زبان ہو کر بولی۔ ”بھلا اگر ایسا کبھی ہمارے زمانے میں ہوتا تو ہم تو پتے پاندھ کر ہی گزارہ کر لیتے اور سجدہ سے سر نہ اٹھاتے کہ اتنے کم وقت میں گھر بار، کاروبار اور دیگر کام کاج کی طرف کسی کا دھیان ہی کب جاتا.....؟“

حضرت نوح علیہ السلام پھر مسکرائے اور انہوں نے محفل کو تنبیہ کی۔ ”ہاں..... لیکن کتنی عبرت کی بات ہے کہ اسی دور کے انسان اپنی رہائش کے لیے سب سے کپے محل تعمیر کریں گے.....“ سب نمازیوں نے اپنے اپنے کانوں کو جلدی سے یوں ہاتھ لگائے، جیسے وہ سب ابھی تک حضرت نوح علیہ السلام کے دور ہی میں بیٹھے ہوں۔ مولوی خضر نے اپنا درس ختم کیا۔ ”تو ساتھیو..... ہمیشہ یاد رہے کہ یہ دنیا بڑی عارضی جگہ ہے..... اس کے لیے بس اتنی ہی محنت کرو، جتنا یہاں رہنا ہے۔“ سب نمازی درس کے خاتمے پر حسب معمول مولوی صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ مولوی خضر نے سب کے جانے کے بعد غور سے میری جانب دیکھا۔ میں ابھی تک سب سے الگ تھلگ مسجد کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ انہوں نے شاید میری بے زاری محسوس کر لی۔ ”کیوں میاں..... آج من کہیں اور لگا ہوا ہے کیا..... رات میں تہجد کے لیے اٹھا تو نیچے ساحل پر بڑی سی موڑ گاڑی کھڑی دیکھی تھی۔ لگتا ہے تمہارے مہمان آئے تھے۔“ ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکان ابھرا آئی تو کیا انہیں زہرا کی آمد کا پتا تھا۔ ”ہاں..... وہ مجھ سے عبداللہ کا پتا مانگنے آئی تھی.....“ ”ارے..... تو کہہ دینا تھا کہ عبداللہ تو اس کے سامنے کھڑا ہے..... پھر وہ کسے کھوجتی پھر رہی ہے.....؟“ ”وہ مجھے نہیں..... پرانے عبداللہ کی کھوج میں یوں آدھی رات کو ننگے سر چلی آئی تھی۔ میرے ایسے نصیب کہاں کہ وہ مجھے تلاش کرے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ نہایت تلخ ہو گیا۔ مولوی خضر معنی خیز انداز میں بولے ”لیکن آئی تو تمہارے پاس ہی نا..... کل تک جو تمہارے سائے سے بھی کتراتی تھی آج اسے مقدر نے اس قدر مجبور کر دیا کہ یوں آدھی رات کو تمہارے پاس دوڑی چلی آئی۔“ میں نے چونک کر مولوی خضر کی جانب دیکھا۔ واقعی اگر دوسرے زاویے سے دیکھا جاتا تو بات تو ان کی بھی ٹھیک ہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پہ خدا خدا کر کے میرا نام تو آیا، چاہے برسر الزام ہی کیوں نہ آیا۔ گویا سلطان بابا کا وعدہ پورا ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اور دھیرے دھیرے..... ہاں البتہ اس ایقانے عہد کی رفتار بہت ہی آہستہ تھی۔ یا پھر میرا بے چین دل ہی نہایت بے صبر تھا۔ پھر چانک مجھے احساس ہوا کہ آج تک مولوی خضر نے یوں کھل کر تو کبھی مجھ سے زہرا کا ذکر نہیں کیا تھا، لیکن ان کی معلومات سے لگتا تھا کہ انہیں سارے قصے کی بخوبی خبر ہے۔ مجھے اپنی چند لکھوں پہلے والی بے خودی پر ندامت سی محسوس ہوئی۔ ”تو گویا آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں صرف زہرا کے حصول کے لیے اس درگاہ تک آیا ہوں، لیکن آپ نے کبھی مجھ پر یہ جتایا کیوں نہیں.....“ میری سوچ کے دوران وہ حسب معمول اپنے ہاتھ کی مزے دار سی چائے بنا چکے تھے۔ میرے سوال پر دھیرے سے مسکرا دیئے۔ ”میاں..... سب کچھ جتایا تو نہیں جانتا نا.....“

اور پھر دیے بھی یہ تمہارا ذاتی معاملہ تھا۔ میں نے سوچا، تم سے کچھ پوچھوں گا تو تم بھی دل میں سوچو گے کہ بڑے میاں سٹھیا گئے ہیں۔“ مجھے ان کی بات پر ہنسی آگئی۔ ”آپ مجھے ایسا سمجھتے ہیں؟..... آپ سے ایک بات پوچھوں..... آپ برا تو نہیں منائیں گے؟.....“ ”نہیں نہیں..... ضرور پوچھو..... تم مجھے بہت عزیز ہو.....“ میں نے ان کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”آپ نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟.....“

میرا سوال سن کر ان کے چہرے پر بچوں کی طرح حیا کا ایک گلابی رنگ آ کر گزر گیا اور وہ ہنس پڑے۔ ”کیا میاں؟.....؟..... کبھی کچھ اگلا لو گے کیا؟.....؟“ ”بتائیں نا..... آپ نے کبھی کسی کو چاہا ہے..... اور خدا کے لیے جواب میں یہ نہ کہئے گا کہ ہاں کی ہے، پھولوں سے، موسم سے، سمندر سے اور ان سب کو بنانے والے سے..... آپ جانتے ہیں، میں کس سے محبت کی بات کر رہا ہوں.....“ میرے ضدی انداز پر وہ باقاعدہ زور سے ہنس دیئے۔ میں نے اس سے پہلے انہیں یوں ہنسنے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا، نہ جانے کیوں اس لمحے مولوی خضر مجھے بہت اچھے لگے۔ ”ہاں بھی کی ہے..... اپنے زمانے میں ہم نے بھی کی ہے، محبت..... لیکن ہماری محبت میں اور آج کل کی اس طوفانی محبت میں بہت فرق ہے۔ مجھے جس سے محبت ہوئی، اسے میں نے پوری زندگی میں صرف دو مرتبہ دیکھا۔ پہلی بار ایک کتابوں کی دکان پر، جہاں وہ سائیکل رکشے میں اپنی والدہ کے ہمراہ تشریف لائی تھیں اور دوسری مرتبہ ایک لائبریری میں، جہاں ہم نے کسی طور بڑی ہی مشکل سے انہیں آنے کا کہا تھا۔ وہ بس دو منٹ کے لیے آئیں اور جتنی دیر میں لائبریرین کے ہاتھ سے کتاب ان کے ہاتھ میں منتقل ہوئی، بس اتنی ہی دیر ٹھہریں۔ یہ اتنی سی ہی ہے، ہماری محبت کی کہانی۔“ میرا تجسس بڑھ گیا۔ ”تو پھر آپ نے ان خاتون کے ہاں رشتہ کیوں نہیں بھیجا۔ میرا مطلب ہے، آپ نے بات آگے کیوں نہیں بڑھائی؟.....؟“ ”بات بڑھتی تو بڑھاتے نا..... لمبی کہانی ہے، میاں۔ پھر کبھی سنائیں گے..... فی الحال تم بس اتنا جان لو کہ محبت کے ہزار سے بھی زیادہ روپ ہوتے ہیں، لیکن محبت ہمیشہ اس خوشبو کی طرح لا حاصل ہی رہتی ہے جو پر فیم کرتے سے آس پاس فضا میں بکھر جاتی ہے۔ بس ایک کک ہی اس عشق جازی کا حاصل ہے.....“ ”لیکن لوگ محبت میں ایک دوسرے کو پا بھی تو لیتے ہیں..... اس وصل محبت کے بارے میں آپ کیا کہیں گے..... کچھ لوگوں کو ان کی محبت مل بھی تو جاتی ہے۔“ ”محبت کہاں مل پاتی ہے میاں..... بس جسم مل جاتے ہیں..... جانے کس بے وقوف نے اس وصل کو محبت کے وصل کا نام دے دیا ہے۔ محبت ہمیشہ سے ایک لا حاصل جذبہ ہے۔“ میں حیرت سے اس وجہ بزرگ کو دیکھتا رہا۔ ضرور ان کا ماضی کسی شدید محبت کی داستان سے گندھا ہوا تھا۔ ورنہ محبت کے بارے میں اتنا منفرد اور انوکھا نظریہ کسی عام شخص کا تو نہیں ہو سکتا تھا۔

اس دن مولوی خضر سے مل کے درگاہ واپسی کے بعد بھی میں بہت دیر تک ان کے فلسفہ محبت کے بارے میں سوچتا رہا۔ اگر وہ سچ کہہ رہے تھے تو پھر میری زہرا سے محبت کا مقام کیا تھا؟..... کیا حقیقت تھی میری محبت کی؟ کیا میری محبت بھی صرف جسم کے حصول کے لیے ہی تھی؟ لیکن میں نے تو آج تک کبھی زہرا کا جسم پانے کی خواہش تک نہیں کی تھی۔ میں نے تو جب بھی اسے دیکھا، بس اس کے چہرے کے نور میں کھوتا چلا گیا اور پھر جسم، یاروچ کا حصول تو بہت دور کی بات تھی، وہ تو میرے بارے میں سوچتی تک نہ تھی۔ میں ایسے ہی نہ جانے کتنے خیالوں میں بھنور میں پھنسا غوطے کھا رہا تھا کہ اچانک ایک بار پھر میرے ساتھ وہی عجیب سا واقعہ ہوا جو پہلے بھی درگاہ میں عبداللہ کے حجرے میں پہلی مرتبہ داخل ہوتے ہوئے پیش آیا تھا۔ میں کافی دیر سے درگاہ کے صحن میں بیٹھا تسبیح کی مالائیں پرورہا تھا اور اپنی محبت کی حقیقت کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اتنے میں باہر سے کسی چھیرے کی

آواز سنائی دی۔ ”عبداللہ بھائی..... تبیجاں بن گئی ہوں تو دے دو..... میں نیچے بازار کی طرف جا رہا ہوں۔ دکان پر چھوڑتا جاؤں گا۔“ یہ کریم بلوچ کی آواز تھی۔ مولوی خضر نے اسے خاص طور پر تاکید کر رکھی تھی کہ جب بھی وہ ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد نیچے بازار کی طرف جانے لگے تو مجھ سے بھی پوچھ لیا کرے، تاکہ میرا وقت بچ جائے۔ میں نے وہیں سے آواز لگائی۔ ”آیا کریم بھائی.....“ اور اسی لمحے ایک دم میرے ذہن میں پھر ایک جھماکا سا ہوا۔ مجھے یوں لگا کہ کریم پہلے بھی اسی طرح مجھ سے تسبیح کی مالائیں لینے کے لیے یونہی درگاہ کے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر آواز لگا چکا ہے اور میں نے ٹھیک اسی جگہ بیٹھے، اسے یہی جواب دیا ہے اور اب جب میں اسے یہ مالائیں دینے کے لیے باہر نکلوں گا تو وہ مجھے دہائی جانب مسکراتا ہوا کھڑا ملے گا اور پھر ہوا بھی یہی۔ میں ابھی اسی روشنی کے جھماکے کے اثر میں تھا اور جیسے ہی میں بے اختیار ہو کر اٹھا اور باہر نکلا تو کریم وہیں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح یہ تمام احساس لمحے بھر کا تھا اور اگلے ہی لمحے میں پھر سے ”زمانہ حال“ میں واپس پہنچ گیا، لیکن اس بار میرے سر میں درد کی ایک شدید لہر بھی اٹھی تھی۔ میں نے کریم کو تو جیسے تیسے فارغ کر دیا، لیکن پھر خود مجھ سے بہت دیر تک وہاں سے اٹھا نہیں گیا۔ عام طور پر ایسا ہم سب ہی کے ساتھ زندگی میں کبھی نہ کبھی ضرور ہوتا ہے کہ ہمیں کسی واقعے، بات یا منظر کو دیکھ کر چند لمحوں کے لیے ایک دقیقہ سا احساس ہوتا ہے کہ ہم یہ بات پہلے بھی سن چکے ہیں، یا اس سوال کا جواب مخاطب کی زبان سے کیا نکلے گا، یا پھر پہلی مرتبہ کا دیکھا ہوا منظر بھی اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ کچھ ایسا دکھائی دیتا ہے، جیسے ہم پہلے بھی اس مقام سے گزر چکے ہوں۔ لیکن میرے ساتھ اس درگاہ میں آنے کے بعد سے لے کر اب تک صرف ایک مہینے میں تیسری، یا چوتھی مرتبہ یہ واقعہ اس تواتر کے ساتھ پیش آ رہا تھا کہ خود میں بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ آخر یہ کیسا سرا رہے۔ عصر کی نماز کے بعد جیسے ہی مسجد نمازیوں سے خالی ہوئی، میں نے تمام واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ مولوی خضر کے سامنے پیش کر دیا۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر بے حد حیرت ہوئی کہ خلاف معمول مولوی خضر نے میرے تمام سوالات کے جواب میں بات ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے صرف اتنا کہا ”رہنے دو میاں..... بڑی تفصیل طلب باتیں ہیں..... وقت آنے پر تمہیں سب پتا چل جائے گا.....“ میں نے اصرار کیا۔ ”آخر ایسا بھی کیا راز ہے..... پہلے میں نے عبداللہ سے بھی جب اس بات کا ذکر کیا تھا، تب اس نے بھی کچھ ایسا ہی گول مول سا جواب دیا تھا۔ میرا سر درد سے پھٹ جائے گا۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ میری یہ الجھن دور کر دیں..... چاہے اس راز کے افشا ہونے سے میرا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہوتا ہو.....“ انہوں نے ایک لمبا سا سانس لیا۔ ”بہت جلد باڑ ہو..... بہتر ہوتا کہ مناسب وقت کا انتظار کرتے.....“ لیکن میں اپنی ضد پراڑا رہا ”کل کرے سو آج..... آج کرے سو ابھی.....“

مولوی خضر نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالی۔ ”ٹھیک ہے..... یوں لگتا ہے جیسے تمہاری تربیت کا وقت آ گیا۔“



ترتیب

میں مولوی خضر کے منہ سے ترتیب کا لفظ سن کر مزید الجھن میں پڑ گیا۔ وہ میری ترتیب کا ذکر کر رہے تھے؟ کیا زہرا کو پانے کے لیے اب مجھے باقاعدہ کسی ترتیب سے بھی گزرنا پڑے گا..... سوالوں کا ایک طوفان تھا، جو میرے اندر سب کچھ اٹھل پھٹل کر رہا تھا لیکن میں بنا کچھ کہے، دم سادھے ان کے سامنے بیٹھا رہا۔ آخر کار انہوں نے ہی اپنی خاموشی کا قفل توڑا ”سب سے پہلے تم میرے ایک سوال کا جواب دو۔ تمہارے خیال میں اس دنیا کا سب سے بڑا عہدہ ’مقام و مرتبہ‘ کون سا ہو سکتا ہے۔ یاد رہے، ماضی اور حال دونوں زمانوں کا پوچھ رہا ہوں۔“ میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ”شاید کسی سپر پاورڈ کے سربراہ کا عہدہ“ ”نہیں..... نبوت دنیا کا سب سے بڑا عہدہ ’مقام و مرتبہ‘ ہے۔ حالانکہ نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا لیکن اب تک اور آنے والے تمام زمانوں کا سب سے بڑا عہدہ نبوت ہی ہے۔ ہمیشہ اس بات کو یاد رکھنا۔“ ”جی بہتر..... لیکن میں اب بھی آپ کے اس سوال کا مقصد نہیں سمجھا؟“ انہوں نے ایک لمبا سا ہنگارا بھرا۔ ”دراصل جو میں اب کہنے جا رہا ہوں اس کا تعلق میرے سوال سے ہے۔ میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ ہماری دنیا اس کائنات کی لاتعداد دنیاؤں کے مقابلے میں صرف ریت کے ایک ذرے جیسی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارے بالکل قریب، ایک اور مخلوق جسے ہم جنات کے نام سے جانتے ہیں، اپنی دنیا بسائے ہوئے ہیں۔ پھر جانے کتنی کہکشاں، کتنے سیارے اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس ہماری اپنی دنیا کے اندرونی رابطے کے بہت سے ذرائع ایجاد ہو چکے ہیں مثلاً وائرلیس، ٹیلی فون، موبائل وغیرہ جن سے ہم تمام دنیا میں پلک جھپکنے میں مطلوبہ شخص تک رسائی کر لیتے ہیں۔ لیکن ہمارا ایک رابطہ ہمہ وقت اپنے خدا سے بھی تورہتا ہے۔ وہ جو ہماری شرگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ لیکن اس غیر مرئی رابطے کے لیے اب تک کوئی آلہ ایجاد ہوا ہے، نہ ہی کبھی ہوگا۔ اس رابطے کا نظام خود اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ عموماً یہ رابطہ براہ راست نہیں ہوتا اور بالواسطہ ہم کبھی ایک پوشیدہ نظام کے تحت اس رابطے سے جڑے رہتے ہیں۔ لیکن خدا کے اپنے بندے سے براہ راست رابطے کے بھی کچھ ذرائع ہیں۔ میں صرف تین بڑے ذرائع کا ذکر کروں گا۔ وحی، کشف اور الہام۔“ مولوی خضر نے پانی پینے کے لیے ایک چھوٹا سا وقفہ لیا۔ میں نے بے چینی سے پہلو ہولا۔ ان کی اس لمبی تمہید نے میرے اندر ایک عجیب سی بے چینی بھردی تھی۔ خدا خدا کر کے انہوں نے اپنی بات دوبارہ شروع کی۔ ”ہاں تو میں نے فی الحال صرف تین براہ راست رابطوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے پہلا ذریعہ یعنی وحی شرعی کا سلسلہ آخری پیغمبر کے ساتھ ہی موقوف ہو گیا ہے۔ باقی رہ گئے دو ذرائع۔ ان میں سے پہلا ہے کشف، جس کا تعلق حیات سے ہے۔ جس میں کس شخص کو باقاعدہ علم غیب، یا مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کی جھلک نظر آتی ہے اور وہ اس واقعے کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہوا دیکھ سکتا ہے۔ ایسے انسان کو کاشف کہتے ہیں اور اس کا یہ کمال کشف کہلاتا ہے۔ جب کہ تیسرے ذریعے کو ”الہام“ کہا جاتا ہے۔ الہام کا تعلق وجدانیات سے ہوتا ہے۔ وجدان یعنی انسان کو باقاعدہ کچھ نظر تو نہ آئے، پر خدا کی طرف سے اس کے دل میں ایک خیال ڈال دیا جاتا ہے کہ فلاں

واقعہ کچھ یوں ہوا ہوگا، یا فلاں شخص کس حال میں ہوگا، یا فلاں دو راستوں میں سے ایک راستہ اسے اس کی کامیابی کے راستے پر لے کر جائے گا۔ لیکن یہ سب اللہ کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ اپنے کن خاص بندوں کو الہام، یا کشف کے مرتبے کے لیے چنتا ہے۔“

مولوی خضر نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر مجھ سے پوچھا۔ ”میری بات سمجھ میں آرہی ہے نا.....“ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو انہوں نے پھر سے سلسلہ جوڑا۔ ”لیکن ایک بات تو طے ہے کہ ایسا کمال ہر ایک کو تو عطا نہیں کیا جاتا، ضرور اس بندے میں کوئی خاص بات تو ہوتی ہوگی۔ میرے نزدیک وہ خاص وصف خالص پن ہے جسے انگریزی میں Purity کہتے ہیں۔ ہم انسان عالم ارواح میں انتہائی معصوم ہوتے ہیں۔ پھر دنیا میں آنے کے بعد رفتہ رفتہ یہاں کے گناہوں کی آلودگی ہمیں داغ دار کر دیتی ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے، جیسے کسی بچے کے شفاف، بچھڑے کے مقابلے میں کسی لگا تار سگریٹ، یا تمباکو نوشی کرنے والے کے بچھڑے، جو بہت زیادہ کاربن کی وجہ سے ایکس رے میں بھی باقاعدہ کالے نظر آتے ہیں۔ میرا ماننا یہ ہے کہ خدا نے کم از کم الہام کا تحفہ ہر انسان کے لیے طے کر رکھا ہے۔ لیکن ہمارے اندر کی آلودگی ہمارے قلب و نظر کے گرد اس طرح پیرہ بن کر پردے گرا دیتی ہے کہ ہم الہام تو دور، سامنے کی چیز بھی نہیں دیکھ پاتے۔“ مولوی خضر نے پھر سے ایک وقفہ لیا۔ شاید وہ مجھے اس بات کا موقع دینا چاہتے تھے کہ میں ان کی ثقیل باتیں ہضم کر سکوں۔ وہ پھر گویا ہوئے۔ ”اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کشف اور الہام کون اپنے کا پیانہ کیا ہے.....؟ مطلب یہ کہ یہ نعمت بھی تو سبھی میں یکساں بنی ہوئی نہیں ہوتی۔ اس کے بھی باقاعدہ درجے ہوتے ہیں۔ اس کے لیے تمہیں ایک مثال دینا ہوں آج کل سیٹلائٹ کا دور ہے۔ خلا میں بہتی لہروں کے ذریعے خلا کی گنگل بھیجے جاتے ہیں اور ان لہروں کو پکڑنے کے لیے کسی اینٹینا کا سہارا لیا جاتا ہے۔ جس اینٹینا کی اونچائی جتنی زیادہ ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ لہریں وہ پکڑ پاتا ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ ہم سب انسانوں کے سر پر بھی ایک ایسا ہی ان دیکھا اینٹینا موجود ہے۔ جو جتنا بڑا کشف، یا الہامی ہوگا، اس کا اینٹینا دوسروں سے اتنا ہی اونچا ہوگا اور اس غیر مرئی اینٹینا کی لمبائی، یا اونچائی کا براہ راست تعلق خود انسان کی اپنی محنت، عبادت، ریاضت اور پاکیزگی سے بھی ہے۔ جو جتنی کوشش اور ریاضت کرے گا اس کی پہنچ عالم غیب میں اتنی ہی زیادہ ہوتی جائے گی۔ یعنی اس کا اینٹینا سر سے اتنا ہی بلند ہوتا جائے گا۔ آج کل ٹیلی بیٹھی اور ریڈیو وغیرہ کا بڑا اجر چاہے۔ سائنس ان علوم تک بہت دیر میں پہنچی ہے جب کہ ”روحانیت“ نے تو عرصہ قبل یہ سنگ میل عبور کر لیے تھے۔ چین میں ابھی تک باقاعدہ ایسے لوگ پائے جاتے ہیں، جو ننگے پاؤں پانی کی سطح پر یوں چلتے پھرتے ہیں جیسے خشکی پر چل پھر رہے ہوں۔ کوئی ندی، دریا، یا سمندر انہیں ڈوب نہیں سکتا۔ یہ سب صرف اور صرف خود پر قابو پانے کی طاقت ہے، جو انہیں روحانیت سے عطا ہوتی ہے۔ ایک غیر مسلم جب اپنی توجہ اس قدر مرکوز کر سکتا ہے کہ وہ پانی کی سطح پر چلتے ہوئے پیر کے ٹکڑوں کے ٹپے کنٹرول کرتے ہوئے ان کی ساخت عارضی طور پر پانی پر چلنے کے موافق کر لیتا ہے تو پھر سوچو کہ اگر مومن اپنی توجہ مرکوز کرنے پر قدرت حاصل کر لے تو کیا نہیں کر سکتا.....؟؟ اب رہی بات تمہارے سوال کی کہ تمہیں بار بار چند لمبے آگے کی بات کیوں نظر آتی ہے تو میری ناقص اور ذاتی رائے یہی ہے کہ اس کا تعلق بھی اسی کشف اور الہام سے ہے، جس کا میں نے ابھی اتنی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ تمہارا اینٹینا کچھ پکڑنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ لیکن شاید ابھی ہم سب عام انسانوں کی طرح صرف سر کی سطح ہی پر ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا تمہیں مکمل وجدان عطا کرے۔“ میں حیرت سے منہ کھولے ہوئے مولوی خضر کی یہ ساری تمہید سن رہا تھا۔ وہ کہاں کی بات کو کہاں لے جا کر جوڑ بیٹھے تھے۔ بھلا میں کہاں اور یہ روحانیت

کہاں.....؟ ابھی ایک ہفتہ پہلے تک تو مجھے ٹھیک سے نماز بھی پڑھنا نہیں آتی تھی اب بھی جو کچھ کچے سجدے کر رہا تھا۔ مجھے اگرزہرا کو پانے کی ذرا سی بھی ناامیدی ہوتی تو میں ایک پل بھی مزید اس درگاہ میں نہ ٹھہرتا، جب کہ یہ حضرت تونہ جانے کہاں سے قلابے کہاں ملتا رہے تھے۔ میں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں..... آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میرے یہاں آنے کا مقصد کیا ہے اور آپ میری ماضی سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ پھر بھی.....“ انہوں نے میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی۔ ”میں نے اسی لیے شروع ہی میں یہ واضح کر دیا تھا کہ کچھ فیصلے قدرت اپنے پاس محفوظ رکھتی ہے۔ کس کو اس کام کے لیے چننا ہے اور کسے نہیں..... یہ فیصلہ بھی تقدیر خود ہی کرتی ہے اور اس فیصلے کے آگے ہم انسانوں کے کبھی جواز دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔“

مولوی خضر اپنی بات مکمل کر کے مغرب کی نماز کی تیاری کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے لیکن میری ذات کو ادھر ابھٹکتے چھوڑ گئے۔ پتا نہیں ان کی باتیں سننے کے بعد مجھے ایسا کیوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے کوئی ان دیکھا ٹکجہ میرے وجود کے گرد کستا جا رہا ہے۔ یہ سلطان بابا مجھے کس گورکھ دھندے میں الجھا گئے تھے۔ میں تو اپنی پہلی اور ظاہری دنیا ہی سے بے زار تھا۔ یہ دوسری دنیا کا عذاب بھلا اب کون جھیلے گا.....؟ میں نے وہیں مسجد میں بیٹھے بیٹھے اپنی زندگی میں شاید پہلی مرتبہ گڑگڑا کر اپنے رب سے دعا کی کہ مجھے مزید کسی امتحان میں نہ ڈالے کہ میں بہت ہی عام اور کمزور سا بندہ ہوں۔ مجھ میں اب مزید کوئی عذاب سہنے کی ہرگز سکت نہیں ہے۔ مجھے پتا نہیں چلا کہ کب میں اپنی اس لتجا میں اتنا غرق ہوا اور کب میرا چہرہ میرے آنسوؤں سے دھلنے لگا۔ لیکن اس روز اس سناٹے میں میری ہچکیاں سننے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ دنیا میں مجھ جیسا کون ہوگا، جس نے اپنی محبت پانے کے لیے اپنی سانسیں تک گروی رکھ دی ہوں۔ آخر قدرت کو مجھ پر رحم کیوں نہیں آتا تھا؟

عشاء کی نماز کے بعد میرا دل جب بہت گھبرانے لگا، تو میں نے ساحل کی چہل قدمی کا ارادہ کر لیا۔ مولوی خضر نماز کے فوراً بعد ہی نیچے ساحلی بستی میں نہ جانے کس نمازی کی تیمارداری کے لیے جا چکے تھے۔ میں تنہا ہی ساحل کی طرف چل پڑا۔ ٹھنڈی ہوا چہرے سے ٹکرائی تو کچھ ٹھن کیل کا احساس کم ہوا۔ میں نہ جانے کتنی دیر یونہی اپنی دھن میں ساحل کے کنارے کنارے چلتا گیا۔ اچانک دور ساحل پر چند روشنیاں تیزی سے مجھے اپنی جانب بڑھتی ہوئی نظر آئیں اور پھر کچھ ہی دیر بعد سائیکل کی آوازوں سے پتا چل گیا کہ کچھ ساتھ بیوی بائیکس ساحل پر دوڑتی ہوئی میری جانب آرہی ہیں۔ کچھ ہی دیر میں اس چنگھاڑتے شور میں ان موٹر سائیکل سواروں نے مجھے کراس کیا۔ یہ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کا ایک ٹولہ تھا جو شاید شہر سے دور اس ویران ساحل پر ریس لگانے کے لیے آیا تھا۔ ہر موٹر سائیکل پر ایک لڑکے لڑکی کا جوڑا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ سبھی چیخ چلا رہے تھے، نعرے لگا رہے تھے۔ میرے ہونٹوں پر خود بخود ایک دھیمی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ کچھ ”میٹھی یادوں“ نے میری رگوں میں بہتی کڑواہٹ کو کافی کم کر دیا۔ مجھے اپنے دوستوں کے ساتھ لگائی گئی ایسی کئی ریسوں اور ہنگاموں کا دور یاد آ گیا۔ ہمارے گرد وپ میں کاشف سب سے اچھا بایک رائڈ تھا لیکن میں اسے بھی بہت دفعہ ریس میں ہرا چکا تھا۔ میں اپنی یادوں کی جھونک میں بہت آگے چلا آیا تھا۔ ساحلی بستی کی روشنیاں تقریباً غائب ہو چکی تھی۔ لہذا میں نے واپسی کا فیصلہ کیا ابھی میں درگاہ سے کچھ فاصلے ہی پر تھا کہ مجھے وہی موٹر سائیکل سوار گرد وپ ساحل کے کنارے کھڑا نظر آیا۔ وہ سب کے سب ایک موٹر سائیکل کے گرد جمع تھے۔ شاید اس بایک میں کوئی خرابی ہو گئی تھی۔ میں ان کے قریب پہنچا تو وہ سب میری جانب متوجہ ہو گئے۔ ان میں سے

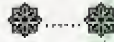
ایک شوخ سے لڑکے نے زور سے کہا۔ ”سلام مولانا جی۔۔۔۔۔ یہاں آس پاس کوئی گیراج ہے تو پلیر بتائیے۔“ اس کے مولانا کہنے پر پہلے تو مجھے یہ گمان ہی نہیں ہوا کہ وہ مجھ سے مخاطب ہے لیکن جب اس نے دوبارہ زور سے کھکار کر مجھے متوجہ کیا تو میں رک گیا۔ میرے علاوہ وہاں اور تھا ہی کون جسے وہ پکارتا۔ پھر میرا ہاتھ بے اختیار میری دو ہفتوں سے بھی زیادہ بڑھی ہوئی شیوکی جانب چلا گیا۔ میں اس وقت کرتے پا جاے میں ملبوس، سر پر سفید ٹوپی اور بڑھی ہوئی داڑھی لیے ان کے سامنے کھڑا تھا۔ ایسے میں ان کا مجھے ”مولانا“ سمجھنا اور پکارنا بالکل جائز تھا۔ مجھے یہ سوچ کرنی آگئی کہ نہ جانے میں خود اس سے پہلے کتنے ایسے ظاہری حلیے والوں کو باقاعدہ مولوی سمجھتا رہا تھا۔ ہم انسان بھی کس قدر ظاہر پرست ہوتے ہیں۔ لباس اور حلیے کی بنیاد ہی پر درجہ بندیاں کرتے پھرتے ہیں۔ دل کے حال پر کبھی نہیں جاتے۔ میں نے جواب دیا۔ ”جی فرمائیے۔“ سارا گروپ مجھے نہایت دل چسپی سے دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے شریہ آنکھوں والی ایک لڑکی بولی ”جناب کسی قریبی ورکشاپ کا پتا بتادیں۔ ہماری بانیک خراب ہوگئی ہے۔“ میں نے خراب موٹر سائیکل پر دوری سے نظر ڈالی۔ جرمنی کی 700 سی سپر ٹرانف (Super- tranf) تھی۔ کسی زمانے میں یہ میری بھی پسندیدہ سواری رہ چکی تھی۔ ”آپ کہیں تو میں دیکھ لوں.....؟“ میں نے ان سے اجازت طلب کی۔

میری بات سن کر وہ سب زور سے ہنس پڑے۔ ایک دوسری چیونگم چباتی لڑکی ہنس کر بولی۔ ”مولوی جی..... یہ سپر ہیوی بانیک ہے..... کوئی سائیکل نہیں ہے، جو بچکر ہوگئی اور آپ اسے ٹھیک کر دیں گے۔“ لڑکی کی بات سن کر پورا گروپ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی۔ ”ہے تو سائیکل ہی نا..... بس ساتھ میں موٹر جڑ گئی ہے۔“ میں نے آگے بڑھ کر سیلف چیک کیا۔ موٹر سائیکل لک سے نہیں، بلکہ سیلف سے اشارت ہوتی تھی۔ سیلف ٹھیک تھا۔ میں نے ڈسک بریک دیکھی اور ایئر لیور کو دو تین بار پکڑ کر چھوڑا۔ سارا گروپ حیرت سے میری ”کارروائی“ دیکھ رہا تھا۔ میں نے حتمی نتیجے پر پہنچ کر سر اٹھایا۔ ”بریک کی ڈسکس (Discs) ایک دوسرے میں پھنس گئی ہیں۔ شاید بریک لگاتے وقت کچھ کوٹھیک طرح سے نہیں دبایا گیا۔ آپ میں سے کسی کے پاس کٹ بیک ہے؟“ سبھی گروپ کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ اب کھکار نے کی باری میری تھی۔ پھر جیسے میری کھکار سن کر سبھی کو ہوش آ گیا اور ایک لڑکا جلدی سے کٹ بیک لے کر میری طرف بھاگا۔ باقی سب بھی بیک وقت بولنے لگے۔ ”واؤ (wow) یار..... کمال ہے..... اس امیزنگ..... آپ کو تو پوری بانیک کی انجینئرنگ کا پتا ہے..... کیا آپ مکینک ہیں.....؟“ ”بس“ مکینک ہی سمجھ لیں..... بس دس منٹ میں آپ کی بانیک تیار ہو جائے گی۔“ میں پوری طرح موٹر سائیکل کی خرابی درست کرنے میں جٹ گیا۔ گروپ کی نظروں میں اب میرے لیے طے کے بجائے سٹائنس تھی۔ وہ سب پھر سے اپنی اسی پرانی بحث میں مصروف ہو گئے جو شاید میرے آنے سے پہلے ان کے درمیان جاری تھی۔ جس لڑکے نے مجھے مخاطب کیا تھا، وہ بولا ”تم لوگ مانو نہ مانو..... مگر مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں پہلے بھی یہاں آچکا ہوں اور تب بھی وہ شپ اسی جگہ ایسکر ڈ تھا۔ شرارتی لڑکی بولی۔ ”کم آن نعمان..... اب یہ نا کہہ دینا کہ یہ تمہارا دوسرا جہنم ہے۔“ میں نادانستہ طور پر ان کی باتوں کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ایک لڑکا بولا ”یار لوگ اس مرر ایج تھیوری (Mirror Image Theory) پر یقین کیوں نہیں کر لیتے۔ نوی کا مسئلہ بھی بس اتنا ہی ہے۔“ ان کی یہ ساری گفتگو زیادہ تر انگریزی میں ہو رہی تھی۔ دوسری جانب سے جینز میں ملبوس ایک لڑکی چلائی ”خدا کے لیے کوئی مجھے بھی اس شیشے کی عکس نما تھیوری کے بارے میں بتائے گا۔“ پہلا لڑکا تفصیل سے بتانے لگا۔ ”بھئی یونانی فلسفے کے مطابق ہماری یہ دنیا دراصل ہو، ہو ایک ایسی

ہی دنیا کا عکس ہے جو بالکل ہمارے سامنے ہی ہستی ہے۔ لیکن ہم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ یعنی جو کچھ وہاں ہو رہا ہے ٹھیک وہ یہاں بھی ہو رہا ہے۔ مطلب یہ کہ ہم میں سے ہر ایک کا ڈپلی کیٹ اس دنیا میں موجود ہے۔ اور یہ جوگز بزلونی کے ساتھ ہو رہی ہے ویسا تب ہوتا ہے، جب ہماری دنیا اور اس دنیا کے عکس کے چند فریم آگے پیچھے ہو جائیں۔ تب ہم لحد بھر کے لیے مستقبل میں جھانک آتے ہیں۔ یار، وہ تم لوگوں نے ہم زاد کا ذکر نہیں سنا..... ہمارا ہم زاد وہی تو ہے۔ اسی جیسی دنیا میں بستا ہمارا ڈپلی کیٹ ہماری کاربن کاپی۔“ میرے ذہن میں ان لوگوں کی باتیں سن کر جھکڑ سے چلنے لگے تھے۔ یہ تو وہی بات کر رہے تھے جس کی ایک روحانی توجہ آج شام ہی کو مولوی خضر نے میرے سامنے پیش کی تھی۔ جب کہ یہ تو بالکل ہی کسی نئی تھیوری کا ذکر کر رہے تھے۔ قدرت میرے ساتھ یہ کیسا کھیل کھیل رہی تھی۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اتنے میں نعمان نے زور دے کر کہا۔ ”میں تو اب بھی کہتا ہوں کہ وقت اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ باہر کے سائنس دانوں نے حال ہی میں کچھ ایسی آوازیں ریکارڈ کر لی ہیں جن کی زبان عبرانی ہے اور جن کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور کی آوازیں ہیں۔ بلکہ وہ تو اس واقعے تک بھی پہنچ گئے ہیں کہ وہاں بات کسی گدھے کے مرنے کے قصے کے بارے میں ہو رہی ہے۔“ تیز طرار لڑکی نے ناک سکیڑی ”تو اس بات سے کیا ثابت ہوتا ہے؟“ نعمان نے اصرار جاری رکھا۔ ”یار جب آواز کے فریم خلا میں زندہ رہ سکتے ہیں اور صدیوں بعد بھی پکڑے جاسکتے ہیں تو پھر ہماری تصویریں بھی فضا میں کہیں نہ کہیں کسی تہہ میں ضرور باقی رہتی ہوں گی۔ تم دیکھنا جلد ہی ایک ایسی مشین بھی وجود میں آ جائے گی جو ہمیں ہمارے مستقبل نہیں تو کم از کم ماضی میں ضرور پہنچا دے گی، جہاں ہم خود اپنی آنکھوں سے اپنا بچپن، اپنے والدین اور دیگر حالات دیکھ سکیں گے۔“ شرارتی لڑکی خاموشی سے چلائی ”واؤ..... ویس گریٹ..... یو مین ٹائم مشین..... کاش اس وقت ہم سب بھی زندہ ہوں اور اپنے ماضی میں جھانک سکیں.....“

اتنے میں، میں بھی اپنا کام ختم کر چکا تھا۔ میں نے نعمان کو سیلف مارنے کا کہا۔ اس نے سیلف مارا اور موٹر سائیکل ایک جھٹکے سے اشارت ہو گئی۔ سب نے خوشی کے مارے سیٹیاں بجاائیں اور نعرے لگائے اور اپنی اپنی جوزی کے ساتھ موٹر سائیکلوں پر بیٹھ گئے۔ نعمان نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور اپنی جیب سے کچھ نوٹ نکال کر دینے چاہے۔ میں نے مسکرا کر نوٹ واپس اس کی شرٹ کی جیب میں رکھ دیئے اور اوپر درگاہ کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ ”میں وہاں رہتا ہوں..... کبھی وقت ملے تو وہاں آئیے گا۔ میں آپ کو اس بایک کے بارے میں کچھ ایسی ہدایات دوں گا کہ پھر یہ آپ کو مہینوں تک نہیں کرے گی۔“ نعمان نے گرم جوشی سے بایک پر بیٹھے بیٹھے ہی آگے بڑھ کر مجھے گلے لگایا اور کہا ”اوہ شیور..... Sure میں ضرور آؤں گا۔“ شرارتی لڑکی نے بھی جاتے جاتے جلدی میں مجھ سے ہاتھ ملایا اور وہ سب ہی میرا شکریہ ادا کرتے اور شور مچاتے ہوئے وہاں سے روانہ ہو گئے۔ جانے میں ساحل پر چہل قدمی کے لیے کیوں اترا.....؟ جانے یہ گروپ وہاں کیوں آیا اور ان تک میری رسائی کیوں ہو پائی.....؟ شاید یہ سارا کھیل ہی مجھے اس نئی تھیوری تک پہنچانے کے لیے تھا.....؟ میں نے دل میں ارادہ کیا کہ کل صبح موقع ملے ہی سب سے پہلے مولوی خضر سے اس یونانی فلسفے کے بارے میں بات کروں گا۔ کیا واقعی ہمارا کوئی ہم زاد بھی ہوتا ہے۔ بالکل ہمارے جیسا؟ ہمارا ہم نام، ہم پیشہ؟ لیکن اگلا دن جمعرات کا تھا اور حسب معمول فجر کے بعد ہی سے دیرے دیرے درگاہ پر حاضری دینے والوں کا ہجوم بڑھتا گیا۔ اس روز ویسے بھی نہ جانے کیوں اس قدر بھیڑ تھی کہ مجھے سر اٹھانے کی فرصت بھی نہیں مل سکی اور یونہی دیکھتے دیکھتے عصر کا وقت بھی ہو گیا۔

آج میرا دل بالکل ہی بجا ہوا تھا۔ شاید اس لیے کہ میں جانتا تھا کہ زہرا کو اب یہاں آنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اسے اپنے عبداللہ کا پتال چکا تھا اور شاید اب وہ ہر جمعرات کو سینکڑوں میل کا سفر کر کے اس درگاہ کی زیارت کو جایا کرے گی، جہاں اسے اس کے من کی مراد مل سکتی تھی اور پھر وہ درگاہ کی زیارت کو یہاں آتی ہی کب تھی.....؟ وہ تو صرف عبداللہ کی زیارت کے لیے آتی تھی۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک میری نظر محسن کے پار دروازے پر پڑی۔ کچھ دیر تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا۔ ہاں..... وہ وہی تو تھی..... تھکی تھکی..... نڈھال سی..... اپنے آپ اور اس سارے زمانے سے بے زار۔ میں نے لوگوں سے نظر ہچا کر دوبارہ اپنی آنکھیں مل کر دیکھا لیکن وہ زہرا ہی تھی۔ آج صرف اس کی خامدہ ہی اس کے ساتھ تھی۔ وہ عورتوں والے حصے کی طرف بڑھ گئی اور لا تعلق سی ہو کر ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کی نوکرائی جلدی اسے پنکھا جھلنے لگی۔ زہرا کی حالت بہت ابتر تھی۔ شاید وہ کسی لمبے سفر کی تھکان کے زیر اثر تھی، یا پھر کسی اندرونی کش مکش نے اس کو اتنا نڈھال کر رکھا تھا۔ میرے دل میں شدید یہ خواہش ابھری کہ میں کسی طرح اس سے معلوم کر دوں کہ اس کی عبداللہ سے ملاقات ہوئی، یا نہیں۔ لیکن میری یہ حسرت دل میں ہی دبی رہ گئی۔ کچھ ہی دیر میں مجھے اپنے کمرے میں جانا پڑا اور نذر و نیاز اور مسائل کے حل کا مرحلہ شروع ہو گیا۔ مردانے سے فارغ ہو کر میں عورتوں والی کھڑکی کی جانب آیا تو حسب معمول میری سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اس کی روح میں اتر جانے والی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ آج اس کی آواز میں بھی تھکن کا غلبہ تھا۔ ”اگر میں آپ سے کچھ مانگوں..... تو کیا آپ دیں گے.....؟“ میرا دل زور سے دھڑکا۔ شہنشاہ خود سوالی ہی سوال کر رہا تھا۔ ”میرے پاس میری اس لا حاصل زندگی کے علاوہ اور کچھ نہیں بچا۔ پھر بھی آپ کہیں.....“ کچھ دیر دوسری جانب خاموشی رہی جیسے وہ کسی شدید ذہنی کش مکش میں مبتلا ہو۔ پھر اس کی آواز ابھری۔ ”آپ..... میں چاہتی ہوں کہ آپ یہ درگاہ چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں.....“



پہلی جیت

پہلے پہل تو میں سمجھ ہی نہیں پایا کہ وہ کہنا کیا چاہتی ہے۔ میں نے وضاحت چاہی۔ ”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا..... آپ مجھے کہاں بھیجنا چاہتی ہیں۔“ ”کہیں بھی..... آپ کہیں بھی چلے جائیں..... بس یہ درگاہ چھوڑ دیں۔ آپ دھیرے دھیرے میرے راستے کی رکاوٹ بننے جا رہے ہیں۔ آپ کی وجہ سے عبداللہ کو یہاں سے کہیں اور جانا پڑا اور جب میں وہاں ان تک پہنچی تو انہوں نے مجھے اس درگاہ کی حاضری کا حکم دے دیا۔ میں ان کا حکم تو ٹال نہیں سکتی، لیکن آپ سے درخواست تو کر سکتی ہوں کہ آپ ہی میرے حال پر رحم کھائیے براہ مہربانی آپ یہاں سے چلے جائیں۔ ہو سکتا ہے آپ کے جانے کے بعد وہ دوبارہ یہیں آجائیں۔“ وہ بولتی جا رہی تھی اور میرے دل پر نہ جانے کتنی چھریاں چل رہی تھیں۔ تو گویا اس کی آج کی حاضری کا مقصد بھی اسی رقیب کی مدح سرائی تھا، جو پہلے ہی میری محبت پر ڈاکہ ڈال چکا تھا۔ مجھے زہر کی سنگ دلی کا اس شدت سے احساس ہوا کہ روح کے نازک دھاگے ادھڑنے لگے۔ کیا اسے میری حالت کی ذرا بھی پروا نہیں تھی۔ میں یہاں صرف اور صرف اسی کے لیے تو بیٹھا ہوا تھا۔ کیا میری محبت اتنی ہی حقیر اور فضول تھی کہ آج تک اس پتھر پر ایک دراڑ بھی نہ ڈال پائی تھی۔ میری طرف سے گہری خاموشی پا کر اس جلاد نے مجھے پھر میری موت یاد دلائی۔ ”میں آپ کے جواب کی منتظر ہوں۔“

زندگی میں پہلی مرتبہ میرے اندر کی کڑواہٹ باہر نکل آئی۔ ”آپ جواب کہاں چاہتی ہیں۔ آپ کو تو بس حکم سنانا ہے۔ سو، آپ نے سنا دیا۔ اب یوں کہیں کہ آپ قہیل کی منتظر ہیں۔“ اسے شاید اپنے لہجے کی سختی کا کچھ احساس ہوا۔ ”اگر میری کسی بات سے آپ کو دکھ ہوا ہے تو میں معافی چاہتی ہوں۔ آپ میری ابتر حالت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ میں اس وقت ڈوب رہی ہوں جب کنارہ بس سامنے نظر آ رہا ہے۔ مجھ پر رحم کریں، پلیز۔“ جلاد سر قلم کرنے سے پہلے سزائے موت کے مجرم سے رحم کی اپیل کر رہا تھا۔ ”ٹھیک ہے اگر آپ میرے سر پر کھڑے ہو کر ڈوبنے سے بچنا چاہتی ہیں تو مجھے یہ موت بھی منظور ہے۔ میری دعا پھر بھی یہی ہوگی کہ خدا آپ کی کشتی پار لگا دے۔ لیکن میں یہاں کچھ شرائط کے تحت اور کچھ معزز لوگوں کے وعدوں اور ضمانت پر آیا ہوں۔ مجھے کچھ مہلت دیجئے تاکہ میں یہاں سے جانے کا کوئی مناسب موقع اور بہانہ ڈھونڈ سکوں۔ مجھے یہاں سے جانے کے بعد اپنا سامنا بھی کرنا ہے۔ امید ہے آپ مجھے خود اپنے سامنے ذلیل ہونے پر مجبور نہیں کریں گی۔“ ”ذلیل نہیں..... خدا نخواستہ..... ساحر میں جانتی ہوں، میں آپ کو کتنی مشکل میں ڈال رہی ہوں..... لیکن آپ نہیں جانتے..... بس آپ نہیں جانتے۔“

جانے وہ کیا کہنا چاہتی تھی لیکن اس کی آواز آنسوؤں میں رندھ گئی اور وہ تیزی سے وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ میں ویسے ہی اپنی جگہ پتھر بنا بیٹھا رہا۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے میرا نام ”ساحر“ پکارا تھا۔ یہ چار حرف اس کی زبان سے نکل کر کس قدر محترم، کتنے بلند ہو گئے تھے۔ مجھے یوں لگا کہ میرے بے معنی سے نام کو اس کی زبان نے معنی دے دیے تھے۔ ساحر..... پہلے تو کبھی مجھے میرا نام اتنا اچھا نہیں لگا تھا۔ لیکن وہ جاتے

جاتے بھی مجھے ایک امتحان میں ڈال گئی تھی۔ جانے سلطان بابا اور عبداللہ کو میں یہ بات کیسے سمجھا پاؤں گا کہ جس کے لیے میں اس امتحان گاہ میں آ کر بیٹھا تھا، وہی نہیں چاہتی کہ میں سارے پر پے حل کر کے سرخرو ہو سکوں۔ جب امتحان نے امتحان سے پہلے ہی نتیجہ سنا دیا تھا کہ کامیابی میرا مقدر نہیں تو پھر اس آزمائش کا تکلف بھی کیوں؟

شام کو مغرب کے بعد جب فراغت ملی تو میں نے سب سے پہلے مولوی خضر کو کل رات ساحل پر موٹر سائیکل گروپ سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں بتایا اور اس کے ساتھ ہی انہیں اس ”نکس آئینہ“ تھپوری کے بارے میں بتایا کہ میں ان کی بات سن کر کافی الجھ سا گیا ہوں۔ خاص طور پر ہم زاد والی بات سن کر تو خود مجھے بھی ایک لمحے کو ایسا لگا تھا کہ کہیں واقعی میرا ہم زاد ہی تو میرے ساتھ ساتھ نہیں چلتا۔ جو مجھ سے پہلے ہی ہر مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ مولوی خضر نے غور سے میری بات سنی۔ ”وہ نوجوان ٹھیک کہہ رہا تھا میاں..... ایسا ایک نظر یہ بھی موجود ہے، جو اس دنیا کو پہلے سے ہونے والے واقعات کا تسلسل بتاتا ہے۔ سائنس میں اس کے علاوہ بھی دنیا کے وجود میں آنے کی کئی توجیہات پیش کی گئی ہیں مثلاً بگ بینک کا نظریہ ڈارون کی تھیوی وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ بھی ایک اور دل چسپ نظریہ موجود ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کائنات کی اور اس دنیا کی پوری فلم پہلے ہی سے بنا کر کیسٹ میں بند کر دی گئی ہے۔ بنانے والے مالک نے پہلے ہی سے پوری فلم دیکھی ہوئی ہے۔ یعنی ازل سے ابد تک سب کچھ فلما یا جا چکا ہے۔ آگے جو ہونا ہے، وہ بھی کیسٹ موجود ہے اور یہ الہام، یا کشف، یا مستقبل بینی ان کے حصے میں آتی ہے، جو فلم کے اگلے حصے کے چند مناظر اپنی کسی خاص روحانی طاقت کی وجہ سے پہلے ہی دیکھ لیتے ہیں۔ اسی تصور پر کام کرتے ہوئے بیرونی ملکوں کے سائنس دان ٹائم مشین کی تخلیق کی کوششوں میں جانے کب سے لگے ہوئے ہیں، کیونکہ ان کے خیال میں ابد تک فلم موجود ہے تو مستقبل میں بھی سفر کیا جاسکتا ہے اور باقاعدہ مستقبل، یا ماضی میں جا کر حالات و واقعات کا مشاہدہ بھی ممکن ہے۔ میں نے کہا تا میاں، ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے، حضرت انسان کی کھوج کا یہ سفر اسے ایسے نظریات اور مفروضوں تک لے جاتا رہے گا اور حقائق سامنے آتے رہیں گے۔ البتہ ایک مسلمان کا عقیدہ اٹل ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے انسانی حیات کا سلسلہ شروع ہوا ہے اور اب قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ ہمارا دوسرا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ تقدیر اٹل ہے اور صرف دعا تقدیر بدل سکتی ہے۔ ہمارا قسمت کا فلسفہ بھی تو کسی نہ کسی طرح سب پہلے سے طے شدہ ہونے، یا پھر بقول مغربی محقق ”سارے عمل کی مکمل فلم بندی، ہونے کو سہارا دیتا ہے نا۔ بس بنیادی فرق عقیدے کا ہی رہ جاتا ہے ورنہ مغربی سائنس دان بہت سی باتوں میں خود اسلام کی ترویج کر رہے ہیں۔ چاہے انجانے میں ہی سہی۔“

میں حیرت سے مولوں خضر کی باتیں سن رہا تھا۔ ہمارے ارد گرد کتنے اسرار، راز بکھرے پڑے ہیں اور ہم نہ جانے کن چیزوں میں اپنا دھیان کھپاتے رہتے ہیں۔ دوسروں کو تو چھوڑے، خود میں کہاں ان اسرار و رموز کی حقیقت جاننے کے لیے یہاں آیا تھا۔ میرا مقصد بھی تو صرف اور صرف زہرا ہی تھی اور اب تو شاید اس کہانی کا خاتمہ بھی قریب آ چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ ایک آدھ دن میں کوئی مناسب سا موقع دیکھ کر خود مولوی خضر سے اپنی زہرا سے ہونے والی اس آخری بات چیت کا احوال بیان کر کے درخواست کروں گا کہ کسی طور پر عبداللہ، یا سلطان بابا کو میرے والدہ جی کے ارادے سے مطلع کر دیں۔ میں درمیان میں صرف ایک مرتبہ، ایک دن کے لیے گھر ہو کر آیا تھا۔ جب کہ ممّا، پپا سمیت تمام دوستوں کو سختی سے پہلے

مہینے میں درگاہ ملنے آنے سے منع کر رکھا تھا، کیوں کہ میں کسی بھی حوالے سے کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ البتہ حسب وعدہ والدین سے ملنے کے لیے ہر دو ہفتے میں ایک رات تو اپنے گھر پر گزارتی تھی۔ میں جب گھر پہنچا تھا، جب ماما اور پاپا دونوں ہی بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے اور شام ہونے سے پہلے میرے دوستوں کا بھی جم گھٹا سا لگ چکا تھا۔ وہ سب مجھ سے ایسا برتاؤ کر رہے تھے جیسے میں جانے لگتی صدیوں بعد ان سے ملا ہوں۔ باقاعدہ جشن کا سا ساں تھا۔ میں درگاہ میں پندرہ دن گزار کر پہلی مرتبہ گھر گیا تھا اور ان پچھلے پندرہ دنوں میں میری ایک بھی نماز قضا نہیں ہوئی تھی۔ پہلی وجہ تو سلطان بابا کی شرط تھی اور دوسری مولوی خضر کا ہمہ وقت ساتھ۔ وہ ہر نماز کے وقت سے پہلے ہی پیغام بھیج بھیج کر، مسجد پہنچنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ سچ ہے کہ اگر مولوی صاحب نہ ہوتے تو مذہب سے میرا یہ تعارف اتنا آسان نہیں ہوتا اور پھر مجھے تو ویسے بھی نماز بہت مشکل اور پابند کر دینے والا عمل لگتا تھا۔ کچھ ہمارے گھر کا ماحول بھی ایسا تھا کہ نماز وغیرہ کی پابندی شاذ و نادر ہی کی جاتی تھی۔ ماما کو سال میں کبھی ایک آدھ بار جوش چڑھتا تو کوئی محفل میلاد وغیرہ منعقد کر دالیتی تھیں۔ لیکن مجھے تو وہ بھی میلاد کی محفل سے زیادہ ”فیشن پریڈ“ لگتی تھی۔ رہ گئے پاپا تو کبھی کبھار ہمارے ڈرائیور کی دیکھا دیکھی ججہ، یاعید کی نماز پڑھنے کے لیے اپنی مرشد بیزن میں قریبی جامع مسجد تک چلے تو جاتے تھے لیکن زندگی میں کبھی بھی مجھے اپنے ساتھ نماز کے لیے جانے پر اصرار نہیں کیا تھا۔ مذہب ہمارے گھر میں ایک فالتو بلکہ کسی حد تک ممنوعہ شے تھی۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں جب میں سکول میں اپنے دوستوں کو رمضان میں روزہ رکھتے ہوئے دیکھتا تھا تو گھر آ کر میں بھی ماما پاپا سے روزہ رکھنے کی ضد کرتا تھا، لیکن نہ تو انہوں نے خود کبھی رمضان کی پابندی کی تھی اور نہ کبھی مجھے روزہ رکھنے دیا۔ ماما کو ہمیشہ اپنے لاڈ لے بیٹے کی صحت کرنے کا غم کھائے جاتا تھا۔ البتہ وہ خود کبھی کبھار ستائیسویں، یا تیسویں کا روزہ رکھ لیتی تھی۔ رہ گئے پاپا تو ان کا تو سارا سال ہی بیرون ملک دوروں اور سفر کی نذر ہو جاتا تھا۔ لہذا ایسے میں روزہ رکھنے کی بھلا کسے فرصت.....؟ پتا نہیں میرے گھر والے مذہب سے اتنا خوف زدہ کیوں تھے؟ درگاہ میں پہلے دن نماز پڑھتے ہوئے خود مجھے مذہب سے بے حد خوف محسوس ہوا تھا، لیکن پھر رفتہ رفتہ مولوی خضر کی صحبت میں علم ہوا کہ مذہب تو بہت ہی آسان اور دوست نما کوئی چیز ہوتی ہے۔ جسے ٹھیک طرح سے اپنایا جائے تو الناء وہ ہمارے اندر کے خوف اور وسوسوں کو ختم کر دیتی ہے۔ لیکن بہر حال میرے گھر میں مذہب ”شاختی کارڈ“ کے خانے میں لکھا جانے والا ایک لفظ ”مسلم“ تھا۔ ہاں البتہ ایک بہت عجیب بات یہ تھی کہ کوئی بھی موت چند دن کے لیے ہمارے گھر میں بھی مذہب کو یوں پھیلا دیتی تھی، جیسے ہم لوگوں سے زیادہ کٹر مذہبی اور کوئی نہ ہو۔ مجھے یاد ہے کہ میں بہت چھوٹا تھا جب یکے بعد دیگرے پہلے دادا ابو اور پھر دادی جان چند مہینوں کے وقفے سے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ تب ہر موت کے اگلے چند دنوں تک ہمارے گھر میں صرف اور صرف مذہب کا راج تھا۔ جز دانوں میں برسوں سے پڑے قرآن اور سپارے اتار کر ان کی دھول جھاڑی گئی اور ہفتوں گھر میں قرآن خوانی ہوتی رہی۔ ایک مولوی صاحب روزانہ صبح سے شام تک گھر کے وسیع لان میں لگائے گئے شامیانے میں دعا کرنے کے لیے بیٹھے رہتے اور ہمارے گھر کے والان میں ظہر، عصر اور مغرب کی تین نمازیں باقاعدہ جماعت کے ساتھ ہوا کرتی تھیں، جن میں پاپا سمیت وہ تمام ملاقاتی بھی شامل ہوتے، جو تعزیت کے لیے آتے تھے۔ ماما بھی سر پر سفید چادر ڈالے اور ہاتھ میں تسبیح لیے عورتوں کے جم گئے میں درد کرتی نظر آتیں اور میں نے زندگی بھر میں صرف ان ہی دنوں میں ان کے ہاتھ میں قرآن دیکھا تھا مطلب یہ ہے کہ صرف موت ہی ہمارا مذہب سے واحد ذریعہ ملاقات تھا اور چونکہ دادا اور دادی کے بعد گھر میں کسی خونی رشتے کی موت نہیں ہوئی تھی لہذا تب سے مذہب

کے لیے بھی گھر کے دروازے ہمیشہ کی طرح بند تھے۔

جس دن میں درگاہ سے ایک رات گزارنے کے لیے گھر گیا تھا، اس دن میں نے بھی کوئی نماز نہیں پڑھی تھی، حالانکہ اس شور اور ہنگامے میں بھی مجھے تمام نمازوں کے اوقات نہ صرف یاد رہے بلکہ ہر نماز کے وقت میرے اندر ایک عجیب سی بے چینی کی کیفیت بھی ابھری۔ جیسے مجھ سے کوئی اہم چیز چھوٹ رہی ہو۔ مجھے کھودینے کا عجیب سا احساس بھی ہوا لیکن پتا نہیں کیوں، میں اپنے گھر والوں اور دوستوں کے سامنے نماز پڑھنے کی ہمت نہیں کر پایا۔ ایک عجیب سی جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے میں کوئی جرم کرنے چلا ہوں۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے یہ لوگ کیا کہیں گے کہ ”ساحر تو پکا مولوی بن گیا ہے۔ درگاہ جا کر.....“ پتا نہیں، ہمارے گھرانوں میں مولوی جیسا محترم لفظ کیوں اور کب کیسے ایک الزام کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ ہمارا مذہب بے تعلق صرف بچے کے کان میں اذان دلوانے سے لے کر نماز جنازہ پڑھوانے تک ہی رہ گیا تھا۔ درمیان کا مذہب نہ جانے کہاں کھو گیا۔ سو، میں بھی اپنے گھر میں، یا اپنے دوستوں کی محفل میں ایک نماز بھی ادا نہیں کر سکا۔ البتہ واپس آ کر میں نے مولوی خضر سے اپنی اس کمزوری کا ذکر کیا تو انہوں نے دیرے سے مسکرا کر بس اتنا کہا۔ ”چلو جو ہوا سو ہوا، تم یوں کرو کہ ان سب نمازوں کی قضا پڑھ لو۔ مذہب کا کام راستہ دینا ہے، راستہ روکنا نہیں۔“ اب میں ان سے کیا کہتا کہ مجھ سے تو میری پوری زندگی ہی ”قضا“ ہونے کو ہے۔ زہرا کے حصول کی لگن بھی ایک طرح کی امید ہی تھی۔ لیکن جب سے اس نے مجھے اپنا یہ جنون ترک کرنے کی درخواست کی تھی، تب سے مجھے واقعی کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے ”وہ ایک سجدہ“ جس میں اسے مانگنا تھا، وہی مجھ سے قضا ہو چکا ہے۔

میں نے آخر کار حتمی فیصلہ کر ہی لیا اور ایک طویل خط میں عبداللہ کو زہرا کی درخواست کے بارے میں ساری تفصیل لکھ ڈالی۔ عبداللہ کو یہ بھی بتا دیا کہ اب میرا اس درگاہ پر مزید ڈیرہ ڈالنے کا کوئی مقصد ہے نہ فائدہ۔ لہذا وہ سلطان بابا کو بتا دے کہ میں شرط ہارنے کا اعلان کر رہا ہوں اور اس جمعرات کے بعد درگاہ چھوڑ جاؤں گا۔ ہو سکے تو وہ کسی اور خدمت گار کا بندوبست کر لیں، یا پھر عارضی طور پر عبداللہ ہی واپس یہاں آ جائے۔ خط لکھتے ہوئے بھی یہ بات میرے دل میں آئی تھی کہ زہرا بھی تو یہی چاہتی تھی کہ خود عبداللہ اس درگاہ کا انتظام پھر سے سنبھال لے۔ شاید اسی طرح میں اس محبوب کے کچھ کام آ جاؤں؟ ابھی میں خط لکھ کر فارغ ہوا تھا کہ باہر سے کریم کا نعرہ گونجا۔ ”عبداللہ بھائی..... کدھر ہو، آپ کے مہمان آئے ہیں۔“ میں حیرت کے عالم میں درگاہ کے دروازے سے باہر نکلا تو سامنے اس رات والے موٹر سائیکل گروپ کے نعمان اور اسی شریری چیموگم چبانی لڑکی کو کھڑے پایا، جو اس رات بھی نعمان ہی کی بانیک پر بیٹھی ہوئی تھی۔ نہ جانے ان دونوں کو دیکھ کر مجھے ایک انجانی سی خوشی کا احساس کیوں ہوا۔ میں نے گرم جوشی سے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ لڑکی کا تعارف نعمان نے ٹینا کہہ کر کر دیا۔ ٹینا درگاہ کے صحن میں داخل ہوتے ہوئے کچھ ہچکچا رہی تھی۔ میں نے نعمان کو اشارہ کیا تو وہ ٹینا کا ہاتھ پکڑے درگاہ میں داخل ہو گیا۔ ہم صحن ہی میں ایک جانب درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گئے۔ ٹینا نے آس پاس حیرت سے دیکھا۔ ”آپ یہاں رہتے ہیں.....؟ پور نہیں ہو جاتے۔“ مجھے اس کی بات سن کر ہنسی آ گئی۔ ”بہت بور ہوتا ہوں، کبھی کبھی تو اتنا بور ہوتا ہوں کہ خود بوریت بھی مجھ سے بور ہو کر کہیں اور چلی جاتی ہے۔“ وہ دونوں میری بات سن کر ہنس پڑے۔ نعمان نے بتایا کہ وہ حسب وعدہ مجھ سے اپنی بانیک کے بارے میں معلومات لینے آیا ہے۔ میری طرح وہ بھی بیوی بانیکس کا دیوانہ لگتا تھا۔ میں نے بہت تفصیل سے اسے تمام معلومات

سے آگاہ کیا اور ہر پرزے کی الگ الگ خصوصیات بھی بتائیں۔ نعمان اور یثینا دونوں ہی بہت غور اور دل چسپی سے میری باتیں سنتے رہے۔ نعمان نے مجھے بتایا کہ اس نے حال ہی میں شپ کے ذریعے یہ بایک جرمنی سے منگوائی ہے۔ اس لیے اسے شروع شروع میں اسے سنبھالنے میں بہت دشواری پیش آرہی ہے۔ ہماری گفتگو کے دوران ایک بار مولوی خضر بھی کسی کام سے درگاہ آئے اور انہوں نے نعمان اور یثینا کو دعا بھی دی۔ شام ڈھلے وہ دونوں رخصت ہوئے تو بہت خوش تھے۔ یثینا نے تو باقاعدہ درگاہ کی زندگی پر ایک انگریزی اخبار میں فچر لکھنے کا پروگرام بھی بنالیا تھا اور نعمان نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی مجھ سے ملنے دوبارہ آئے گا۔ جانے کیوں میں اسے یہ نہیں بتا سکا کہ اب جب وہ یہاں آئے گا تو شاید مجھ سے اس کی ملاقات نہ ہو۔ کیونکہ دودن کے بعد ہی تو جمعرات تھی۔ میری اس درگاہ میں آخری جمعرات۔

لیکن اگلے دودن میرے لیے بہت ہی کٹھن ثابت ہوئے۔ اس رات مولوی خضر کو شدید بخار نے آگھیرا اور ان کی تیمارداری اور دیگر امور کو نمٹانے میں وقت کچھ یوں گزرا کہ کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ کریم بھی اپنی کشتی لے کر چار دن کے لیے کھلے سمندر میں جال ڈالنے کے لیے جا چکا تھا، لہذا مجھے اپنی مالاؤں کے ساتھ ساتھ مولوی خضر کی تنکوں کی بنی ہوئی ٹوپیاں بھی بیچنے کے لیے جمعرات کو خود بازار جانا پڑا۔ ہمارا طریقہ کار بھی وہی ہوتا تھا جو باقی چھیرے اپنا بازار جانے کے لیے اختیار کرتے تھے۔ یعنی ساحل پر کسی چادر یا لکڑی کے تختے وغیرہ پر مال لگا کر گاہک کا انتظار کرنا، لیکن جانے اس دن ایسی کیا بات تھی کہ کوئی خریدار میری طرف رخ ہی نہیں کر رہا تھا۔ اوپر سے جمعرات کی وجہ سے درگاہ میں زائرین کا رش بڑھتا جا رہا تھا۔ میں سیڑھیوں سے کچھ فاصلے ہی پر اپنی مالاؤں اور مولوی خضر کی ٹوپیاں سجائے بیٹھا درگاہ کی سیڑھیوں سے اوپر جاتے لوگوں کی بھیڑ کو دیکھ رہا تھا اور پریشان ہو رہا تھا کہ نہ جانے اوپر مچن میں موجود دو خدمت گار ٹھیک سے اپنا کام کر رہے ہوں گے، یا نہیں۔ مجھے زیادہ فکر یہ تھی کہ عصر سے پہلے اگر میں اپنی چیزیں بیچ نہیں سکا تو ذر و نیاز کا معاملہ کون بھگتے گا۔ عبداللہ نے جاتے وقت سختی سے مجھے اس معاملے کو ذاتی طور پر نمٹانے کا کہا تھا، کیوں کہ یہ اچھی خاصی رقم کا معاملہ تھا اور لوگوں کی بہت سی امانتیں ہمارے سپرد ہوتی تھیں، ایسے میں کسی اجنبی پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں اسی شش و پنج میں بیٹھا جانے کیا سوچ رہا تھا کہ اچانک کسی راہ گیر کی ٹھوکر لگی اور میری ساری مالاؤں زمین پر بکھر گئیں۔ چند ایک کے دانے بھی لڑی سے علیحدہ ہو کر ریت پر دور تک بکھر گئے۔ نقصان بھی میرا ہوا تھا، لیکن اس پر بھی وہ صاحب جو غالباً اپنی بیگم کو درگاہ کی زیارت کے لیے لے کر آئے تھے، مجھ ہی پر مڑنے لگے۔ ”غضب خدا کا۔ سارا راستہ ان لوگوں نے بند کر رکھا ہے۔ زیارتوں جیسی مقدس جگہوں کو بھی انہوں نے کاروبار کا اڈہ بنا رکھا ہے۔ بیگم، ہم کہتے ہیں کہ ان ہی لوگوں کے بھیس میں وہ چوراچکے بھی چھپے ہوئے ہیں، جن میں سے ایک نے پچھلے ہفتے آپ کا پرس چھین لیا تھا۔“ وہ جانے کیا اول نول کہے جا رہے تھے۔ میں نے اپنی مالاؤں چھتے ہوئے ان سے دھیرے سے بس یہ کہا۔ ”آپ جائیں یہاں سے، میں معافی چاہتا ہوں۔“ لیکن ان کا غصہ بڑھتا ہی گیا۔ اب آس پاس کے لوگ بھی متاثرہ دیکھنے کے لیے جمع ہونے لگے تھے۔ ”نہیں چلے کیسے جائیں۔ ہم تو یہاں کے ایڈمنسٹریٹر سے مل کر رہی جائیں گے۔ یوں راستہ بند کرنے کا آخر مطلب کیا ہے۔ کیسی کھلی بد معاشی کا بازار گرم کر رکھا ہے تم لوگوں نے۔ آج میں اس کا بندوبست کر کے ہی جاؤں گا۔“ میں سر جھکائے ان کی باتیں سنتا رہا۔ کیوں کہ میں اس وقت عبداللہ تھا۔ اگر عبداللہ کی جگہ ساحر ہوتا تو نہ جانے اب تک کیا ہو چکا ہوتا۔ لیکن اگر ساحر ہوتا تو وہ بھلا یوں بازار میں عام مزدوروں کی طرح مزدوری کرنے کیوں بیٹھا ہوتا؟ وہ صاحب یوں ہی گرجتے برستے رہے

اب ان کی بیگم اور باقی بھیڑنے انہیں نوکنا شروع کر دیا تھا کہ چلیں جو ہوا سو ہوا۔ اب جانے دیں۔ بھیڑنے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ میں بنا کچھ کہے، سر جھکائے ان صاحب کی تمام صلواتیں سن رہا ہوں۔ اب جہوم میں سے ایک آدھ شخص نے باقاعدہ ان صاحب کو جھاڑ کر کہا کہ لڑکا خاموش کھڑا کب سے آپ کی گالیاں سن رہا ہے۔ لہذا شرافت کا یہی تقاضا ہے کہ اب آپ بھی یہاں سے آگے بڑھ جائیں۔ لہذا خدا خدا کر کے بادل خواستہ ان صاحب نے قدم آگے بڑھائے اور میں نے لمبا سانس لے کر اپنی نظریں اٹھائیں اور پھر میری نظر کسی کی نظر سے ٹکرا کر جم سی گئی۔ جب وہ صاحب دل کھول کر میری بے عزتی کر رہے تھے اور میں سر جھکائے کھڑا تھا تب نہ جانے کس وقت زیر اپنی ماں اور خادمہ کے ساتھ وہاں سے گزرتے ہوئے شاید بھیڑ کود کچھ کر بھسک چکی تھی۔ یہ سارا تماشا درگاہ کی سیڑھیوں کے قریب اسی راستے پر ہو رہا تھا، جو اس ماہ رخ کی راہ گزرتھی۔ مطلب یہ کہ اس نے میری رسوائی کا یہ سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ زہرا کی والدہ تو زیادہ میری نظر کا سامنا نہیں کر پائیں اور منہ میں چادر کا پلو دباے سسکتی ہوئی وہاں سے خادمہ سمیت آگے بڑھ گئیں، لیکن سنگ مرمر کی وہ مورت وہیں جی کھڑی مجھے دیکھتی رہی۔ چند گھڑیوں ہی میں جانے کتنے طوفان گزر گئے۔ پتا نہیں، یہ میرے اندر کی شدید بے بسی کا احساس تھا، اپنی رسوائی کا غم تھا، یا پھر اس بے رحم کی ناقدری کا شکوہ۔ لیکن جانے کیوں پل بھر میں ہی میری آنکھوں سے بیک وقت دو آنسو نکلے اور شاید نیچے ریتیلی زمین کے بجائے اس نازنین کے دل پر چپکے۔ میری زبان نے تو آج تک کبھی اس سے شکوہ نہیں کیا تھا، پر میری آنکھوں نے شاید اس پل اپنی ساری کہانی کہہ ڈالی۔ پھر زہرا سے بھی وہاں رکا نہیں گیا اور وہ اپنی پلکیں بھینکنے سے پہلے ہی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ میں بھی بوجھل دل کے ساتھ اوپر درگاہ چلا آیا۔ میرے اندر چند لکھوں میں اتنی زیادہ ٹوٹ پھوٹ ہو چکی تھی کہ اب میرا دل کسی کام میں بھی نہیں لگ رہا تھا۔ لہذا میں نے تمام کام مولوی خضر کے اس شاگرد کے حوالے کر دیئے جو جمعرات کے روز خصوصی طور پر میری مدد کے لیے درگاہ آتا تھا۔ حتیٰ کہ عصر کے بعد نذر اکٹھی کرنے کے لیے بھی اپنے کمرے میں نہیں گیا۔ شام وصل رہی تھی اور میں مڈھال سا آنکھیں موندے درگاہ کے صحن کے ایک پوشیدہ گوشے میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ دفعتاً کسی کے قدموں کی ہلکی سی چاپ ہوئی۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ وہ بالکل میرے سامنے کھڑی تھی۔ میرا جسم شل سا ہو گیا۔ اس کی آواز میں لرزش تھی۔ ”آپ مجھ سے جیت گئے۔“



الوداع

میں حیرت سے گنگ بیٹھا رہا، نہ جانے وہ کون سی جیت کی بات کر رہی تھی۔ میں تو اپنی آخری بازی بھی ہار چکا تھا۔ میں نے شکوہ کیا۔ ”طعنہ دے رہی ہیں.....؟“ ”نہیں نہیں“ وہ جلدی سے بولی ”طعنہ نہیں ہے، اعتراف ہے، میں نے آج تک صرف اپنی لگن کو دنیا کی سب سے سچی لگن مانا ہے اور دنیا کا ہر جنوں، مجھے اپنے جذبے کے سامنے ہتھی اور کم تر لگتا تھا، لیکن آج میں یہ اعتراف کرتی ہوں کہ آپ کا جذبہ اور آپ کی لگن شاید اس دنیا ہی سے ماورا ہے.....“ میری حالت اس وقت اس پہ سالاری تھی، جو زخموں سے چور ہو کر زمین پر گر چکا ہو، سانس دھیرے دھیرے ٹوٹ رہی ہوں، مگر سانسوں سے اڑتی خاک کے پس منظر میں، مرنے سے کچھ لمحے پہلے اپنی فوج کو قلعے پر فتح کا جھنڈا لہراتے ہوئے بھی دیکھ رہا ہو۔ زہرا کی آنکھوں میں آنسو تھے اور آج وہ ستم گر بھی میرے جنوں کی داد دے رہا تھا، جس نے مجھے دیوانگی کی اس حد تک پہنچایا تھا۔ اسے روتے دیکھ کر میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا، لیکن میرے لفظ جیسے کہیں کھو سے گئے۔ ”آپ، یہ کیا..... دیکھیں، آپ کے آنسو..... پلیز.....“ میں اسے کیا کہتا خود میری آنکھیں یوں بہہ رہی تھیں، جیسے سارے بند آج ہی ٹوٹے ہوں۔ کتنی عجیب بات تھی، ہم دونوں کا درد جدا بھی تھا اور مشترک بھی..... اور ستم ظریفی یہ بھی تھی کہ ہم ایک دوسرے کو بے وفائی کا الزام بھی نہیں دے سکتے تھے۔ اتنے میں زہرا کی ماں اور ہڑ بڑائی ہوئی سی خادمہ بھی اسے ڈھونڈتے ہوئے وہاں چلی آئیں۔ انہوں نے شاید معاملہ کچھ بھانپ لیا کہ میری حالت زار نے ان کی پتھر دل بیٹی کے سینے پر بھی ”پہلی چوٹ“ مار دی ہے۔ انہوں نے جب میرے سر پر ہاتھ پھیرا تو ہاتھوں کی لرزش صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ بولیں تو لہجہ کا پتہ سا، بھرا ہوا تھا۔ ”خلوں کا ایک شہزادہ کیوں اپنی جوانی اس خاک میں رول رہا ہے، کچھ بھکاریوں کی قسمت میں بھیک بھی نہیں ہوتی بیٹا..... جاؤ اپنی سلطنت کو لوٹ جاؤ..... مجھے اس ماں کی آہ سے ڈر لگنے لگا ہے، جس کی پھول سی اولاد کو ہم نے یوں در بدر کر دیا۔ ہمیں معاف کر دو، ہماری خطا بخش دو.....“ وہ جانے کیا کچھ کہتی اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر روتی رہیں۔ زہرا کی آنکھیں تو پہلے ہی برس رہی تھیں۔ ”اس میں آپ کی کوئی خطا نہیں ہے..... میرا مقدر مجھے یہاں کھینچ لایا ہے اور تقدیر کی مار مجھے تب تک جھیلنی ہی ہوگی، جب تک میرے نصیب میں لکھی ہے۔ بعض سلطنتیں خاک ہو جانے کے لیے ہی ملتی ہیں۔“ اس کے بعد وہ وہاں رک نہیں پائیں اور زہرا کو لے کر درگاہ سے نکل گئیں۔

شام کو میں نے مولوی خضر کو بھی اپنی روانگی کے قصد سے آگاہ کر دیا۔ میری بات سن کر وہ بے حد ادا اس ہو گئے۔ ”کیا کہوں میاں، مجھے تو تمہیں روکنے کا اختیار بھی نہیں۔ پتا نہیں کیوں، چند ہی دنوں میں تم سے کیا عجیب سا قلبی تعلق بن گیا ہے۔ بہر حال جہاں رہو، خوش رہو.....“ میں نے انہیں بتایا کہ خود میرا دل بھی یہاں سے جاتے ہوئے بہت بوجھل ہو رہا ہے۔ کبھی کبھی کچھ انجان سے رشتے بھی کسی سرطان کی طرح تیزی سے خون میں شامل ہو کر رگوں میں اپنی جڑیں بچھا لیتے ہیں۔ کہیں بتائے ہوئے چند دن کچھلی پوری زندگی پر بھائی پڑ جاتے ہیں۔ میں بھی یہاں سے ایسے ہی

رشتے اور درگاہ سے کچھ ایسا ہی تعلق بنا کر واپس لوٹ رہا تھا۔ کتنے بندھن بندھ گئے تھے میرے اس درگاہ سے۔ کتنے اصول رشتوں کی نوکری بھر کر لے جا رہا تھا میں اپنے ساتھ اور پھر وہ ناز آفرین..... کیا ہوا، جو وہ مجھے مل نہیں پائی۔ اس کی محبت کا سدا رہنے والا احساس تو تھا میرے ساتھ، کیا آئندہ زندگی کاٹنے کے لیے یہ سب کچھ کافی نہیں تھا۔ میں نے اس رات بیٹھ کر عبداللہ اور سلطان بابا کے نام الگ الگ لفافوں میں دو خط لکھ کر رکھ دیئے۔ ان سے بناٹے چلے جانے پر معذرت کی اور یہ وعدہ بھی کیا کہ جب میں اپنے اندر کی شرمندگی پر قابو پا لوں گا تو ان سب سے ملنے ضرور آؤں گا۔ فجر کی نماز کے بعد میں نے دونوں خط مولوی خضر کے حوالے کر دیئے۔ وہ بہت دیر تک مجھے گلے لگا کر تھپکتے رہے۔

میں نے ان سے آخری الوداع چاہا تو مسکرا کر بولے۔ ”کیوں میاں، واپس اپنی دنیا جا کر ہمیں بھول تو نہیں جاؤ گے؟ اور کچھ یاد آئے نہ آئے، لیکن مولوی خضر الدین کے ہاتھ کی بنی صبح کی چائے تو تمہیں ضرور یاد آئے گی، ہے نا.....؟“ ان کی بات سن کر پل بھر ہی میں میرے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹنے لگے۔ جانے خدا نے ہم انسانوں کا دل اتنا کمزور کیوں بنایا ہے۔ ہم جا بجا خود کو اذیت دینے والے رشتے کیوں پال لیتے ہیں؟ ماما اور پاپا نے یوں اچانک مجھے گھر دیکھا تو ان پر شاوی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ ماما کو تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں مستقل گھر واپس آ گیا ہوں۔ پاپا بھی بہانے بہانے سے تصدیق کر رہے تھے۔ بڑی مشکل سے میں نے کسی طرح سمجھایا کہ اس وقت شدید تھکا ہوا ہوں اور سونے کے لیے اپنے کمرے میں جانا چاہتا ہوں۔ اگلی صبح میری آنکھ شور، ہنگامے سے کھلی۔ حسب توقع ماما نے میرے سارے دوستوں کو خبر کر دی تھی اور وہ سب نیچے لاؤنج میں جمع ہو کر چلا چلا کر مجھے نیچے بلا رہے تھے۔ ان کو میرے شرط ہار جانے کا یقین ہی نہیں تھا، کیوں کہ اس سے پہلے میں ایسی کئی شرطیں جیت کر اور سرخرو ہو کر واپس لوٹا تھا۔ بہر حال ان کے لیے یہی کافی تھا کہ میں واپس لوٹ کر ان کے درمیان پہنچ چکا تھا، لیکن کیا میں واقعی واپس آ گیا تھا.....؟

دن گزر رہے تھے، لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا کہ میں وہاں ہوتے ہوئے بھی وہاں موجود نہیں۔ گھر میں، دوستوں کی محفل، کلب، پارٹی میں، ہر جگہ جسمانی طور پر پہنچے تو جاتا لیکن گھنٹوں گم صدمہ بیٹھا رہتا۔ یار دوست میری خاموشی سے تنگ آ کر لڑتے جھگڑتے اور میں ہی ان کی ہاں میں ہاں ملاتا رہتا، لیکن نہ جانے کیوں ان لمحات میں مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ میں اپنی روح کہیں دور چھوڑ آیا ہوں۔ سب سے زیادہ مسئلہ مجھے نماز کے اوقات میں ہوتا۔ ایک عجب سی بے چینی اور کسک مجھے گھیر لیتی تھی۔ تب میرے لیے گھر، یا باہر کسی بھی محفل میں بیٹھے رہنا دو بھر ہو جاتا اور مسئلہ یہ تھا کہ کلب، یا گھر کا ماحول میری اس مشکل کو ختم کرنے کی بجائے مزید بڑھا دیتا۔ ایسے میں، میں گھر، یا محفل چھوڑ کر کہیں باہر نکل جاتا۔ کسی پرسکون گوشے کی تلاش میں۔ ایک ایسی ہی سہ پہر جب میرے اندر کی بے چینی آخری حدوں کو چھو رہی تھی، میں گاڑی لے کر گھر سے نکلا اور پتا نہیں کب سینٹرل لائبریری کا بورڈ دیکھ کر شہر کی سب سے بڑی لائبریری کی پارکنگ میں گاڑی پارک کر دی۔ ہال میں مختلف شیفٹ پر موضوع کی کتابوں سے بھرے ہوئے تھے۔ دفعۃً میری نظر ”تصوف“ والے سیکشن میں رکھی کتابوں پر پڑی اور میں یونہی ورق گردانی کے لیے ایک کتاب لے کر ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ کچھ صفحے پلٹے تو میری بے چین روح کو جیسے کچھ مرہم ملا۔ ہاں ٹھیک ہی تو تھا، جانے کب سے میری روح گھٹا ل تھی، بیمار تھی اور حیرت ہے کہ ہم اپنی جسمانی بیماری کے لیے تو ڈاکٹر کے پاس درجنوں چکر لگاتے ہیں لیکن روح کی بیماری ختم کرنے کے لیے کبھی کوئی کتاب تک اٹھا نہیں پاتے۔ پہلے چند صفحوں ہی میں مجھ پر یہ

حقیقت آشکار ہونے لگی کہ تصوف کی دنیا، ہماری ظاہری دنیا سے کہیں زیادہ بڑی ہے۔ ہزاروں لاکھوں لوگ اس دنیا کے باسی ہیں۔ جو ہر غرض، لالچ سے بے پروا ہو کر انسانیت کی خدمت میں مصروف ہیں۔ ان میں ہمارے آس پاس پھرتے عام لوگوں سے لے کر اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہنرمند لوگ بھی شامل ہیں۔ تصوف دراصل روح کی دنیا کا دوسرا نام تھا اور میں اس روحانی دنیا کو چھوڑ کر واپس آ گیا تھا۔ یہ ایسے لوگوں کی دنیا تھی، جو کسی عہدے، مرتبے کی فکر کے بغیر ہم جیسے بھٹکے ہوئے انسانوں کو ان کی اصل راہ پر لانے کے لیے شاید ابد تک مصروف رہنے والے تھے۔ جیسے جیسے میں کتاب کے صفحے پلٹتا گیا مجھے ہر صفحے پر اپنے ایک نئے سوال کا جواب ملتا چلا گیا۔ مجھے پتا چلا کہ مذہب صرف پانچ نمازیں پڑھ لینے، یا روزے رکھ لینے کا نام نہیں، یہ صرف بنیادی فرائض ہیں۔ جنہیں ادا کرنے کے بعد مذہب کا اصل سلیقہ اور اصل نظام شروع ہوتا ہے۔ مذہب تو بانٹنے کا نام ہے، چاہے وہ مذہبی تعلیمات ہوں، یا کوئی دنیاوی شے..... مذہب ہر نعمت، علم اور سلیقے کو دوسروں تک پھیلانے کا نام ہے اور یہی کام عبداللہ، سلطان بابا اور مولوی خضر اس درگاہ کی چھوٹی سی دنیا کے ذریعے کر رہے تھے اور یہ سلسلہ لامحدود تھا۔ گھروں میں، مسجدوں، درگاہوں، دفاتروں میں، سمندروں، پہاڑوں، ساحلوں پر اور نہ جانے کہاں کہاں یہ لوگ پھیلے ہوئے تھے اور نہ جانے کس کس بھیس میں مذہب سے دور اور مجھ جیسے بھٹکے ہوئے لوگوں کو تعلیم دے رہے تھے۔ ہمارے لاکھ دھڑکارنے، مذاق اڑانے اور شک کرنے کے باوجود، یہ دھن کے پکے اپنا فرض سرانجام دے رہے تھے اور میں کس قدر بد نصیب تھا کہ اس نظام کا ایک حصہ بنتے بنتے رہ گیا۔ چند گھنٹوں کے بعد جب میں بو جھل ول لے کر لائبریری سے اٹھا تو یوں محسوس ہوا تھا کہ جیسے کہیں میری یہ ”لائبریری یا تارا“ بھی کسی کی دعاؤں کا اثر تھی؟ مولوی خضر سے جب میں بہت زیادہ سوال کیا کرتا تو میری ساری تکرار کے بدلے میں ان کا جواب صرف اتنا ہی ہوتا تھا۔ ”ٹھیک وقت کا انتظار کرو میاں..... وقت آنے پر قدرت تمہیں ہر سوال کے جواب تک خود پہنچا دے گی.....“ افسوس کہ قدرت نے میرے بہت سے سوالوں کے جواب تو دیئے..... پر بہت دیر سے، یا پھر شاید میں خود ہی کچھ جلد باز نکلا.....

لائبریری سے گھر پہنچنے پہنچتے شام ڈھل چکی تھی اور جیسے ہی میری گاڑی گھر کے قریب پہنچی، میں نے گھر کے گیٹ سے سیاہ شور لیٹ نکلتے دیکھی۔ ہاں..... وہ اسی کی گاڑی تھی۔ لیکن ہمارے گھر، کیوں.....؟ اگلے ہی لمحے مجھے اس گاڑی نے کراس کیا تو میں نے آگے ڈرائیور اور پچھلی سیٹ پر صرف زہرا کی امی کو بیٹھ دیکھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو اس ماہ رخ کی گاڑی اپنے گھر سے نکلتے دیکھ کر شاید خوشی کے مارے میرا دم ہی نکل جاتا، لیکن اس وقت میں ایک الجھن آمیزی حیرت لیے گھر میں داخل ہوا۔ ماما اور بابا پورج ہی میں کھڑے تھے شاید زہرا کی امی کو رخصت کرنے کے لیے آئے ہوں..... مجھے گاڑی سے اترا تا دیکھ کر ماما و البانہ انداز میں میری جانب بڑھیں اور خوشی سے لرزتے ہوئے لہجے میں بولیں۔ ”ساحر بیٹا، ابھی زہرا کی امی آئیں تھیں۔ زہرا نے رشتے کے لیے ہاں کر دی ہے۔“ پل بھر کے لیے تو مجھے لگا کہ ساری زمین گھوم رہی ہے اور یہ آسمان بھی کچھ ہی پل میں میرے سر پر گر جائے گا۔ میرے ماں باپ مجھے گلے لگا کر، چوم کر مبارک باد دے رہے تھے، لیکن مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں روؤں، یا ہنسوں..... خوشی سے چلاؤں، یا دکھ اور اذیت سے چیخ چیخ کر آسمان کو ریزہ ریزہ کروں۔ اپنے جذبات کے اظہار کا کوئی ذریعہ مجھے اس وقت نہیں سوجھ رہا تھا۔ مجھے تو یہ بات سنتے ہی سجدے میں گر جانا چاہیے تھا۔ صدیوں کا سفر طے کرنے کے بعد منزل پانے والے کو بھلا اور کیا کرنا چاہیے؟ لیکن میں اپنی جگہ گنگ سا کھڑا رہ گیا۔ میں جانتا تھا کہ میرے ذہن میں اس وقت سوالوں کا جو طوفان اٹھ رہا تھا، اُس کا کنارہ صرف عبداللہ کی ذات تھی۔ اگلی صبح میری گاڑی ساحل کی

جانب اڑی جا رہی تھی۔ میں عبداللہ کی نئی درگاہ کی طرف جانے سے پہلے احتیاطاً اسے شہر والی ساحلی درگاہ پر دیکھتے ہوئے جانا چاہتا تھا اور پھر درگاہ کے قریب کار پارک کرتے ہی میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ کریم مجھے سیڑھیوں کے قریب ہی بل گیا۔ جس نے بتایا کہ سلطان بابا اور عبداللہ دونوں آئے ہوئے ہیں۔ میں تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے درگاہ کے احاطے تک پہنچا تو دور ہی سے عبداللہ مجھے کسی شخص کو رخصت کرتے ہوئے دکھائی دیا۔ وہ شخص پلٹا تو حیرت کا ایک اور جھٹکا میرا منتظر تھا۔ یہ تو وہی صاحب تھے، جنہوں نے اس دن بازار میں بنا کسی غلطی کے مجھے سرعام اس قدر بے عزت کیا تھا کہ درد کے مارے میرے آنسو نکل آئے تھے۔ عبداللہ اور وہ صاحب بیک وقت مجھے دیکھ کر ٹھٹھکے اور پھر عبداللہ کی ازلی ملائم سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ ”آؤ ساحر میاں..... خوش آمدید۔“ لپٹا نک، ہی وہ صاحب تیزی سے میری جانب لپکے۔ غصے سے میرا چہرہ متمسک سا گیا۔ لیکن یہ کیا؟ انہوں نے آتے ہی میرے ہاتھ پکڑ لیے اور نہایت لجاجت سے بولے۔ ”معاف کرنا بیٹا، اس روز تمہارا بہت دل دکھایا۔ سچ کہو تو گناہ عظیم کیا۔ پر کیا کرتا، بندے کو یہی حکم ملا تھا..... لیکن آفرین ہے تمہارے حوصلے اور صبر پر، میری ہر گالی، ہر چر کے کول پر سہا، لیکن گویا یہ سارا ڈراما صرف میرے اور زہرا کے لیے رچایا گیا تھا۔ وہ صاحب رخصت ہو گئے تو میں نے عبداللہ کی طرف شاکی نگاہوں سے دیکھا۔ ”میں جانتا تھا زہرا کی صورت میں تم مجھے بھیک ضرور دو گے۔ لیکن اگر مجھے بھکاری ہی بنانا تھا تو پھر اتنے کڑے امتحان میں کیوں ڈالا۔ پہلے ہی دن زہرا کو کیوں نہیں کہہ دیا کہ وہ میری طرف پلٹ جائے۔“ ”نہیں تم غلط سمجھ رہے ہو۔ سلطان بابا نے صرف تمہارا امتحان لینے کے لیے اس شخص کو وہاں بھیجا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ پہلے دن آنے والے جلد باز اور غصیلے ساحر اور درگاہ پر چند ہفتے جینے والے عبداللہ میں کتنا فرق ہے۔ زہرا کا وہاں پہنچ جانا صرف ایک اتفاق اور تمہاری قسمت کی بدولت تھا۔“ اگر مجھے یہ پتا نہ ہوتا کہ عبداللہ جھوٹ نہیں بولتا تو شاید میں اس وقت اس کی اس اتفاق والی بات پر کبھی یقین نہ کرتا۔ ”بہر حال، چاہے وہ اتفاق ہی سے وہاں آ پہنچی تھی، لیکن سچ یہی ہے کہ اس کا دل نرم کرنے میں اتفاق نے بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔ میں یہ کیسے مان لوں کہ اس کی ہاں کے پیچھے مزید کوئی اتفاق چھپا ہوا نہیں ہے۔“ عبداللہ مسکرایا ”اگر تم اس روز بھڑک کر اس شخص کو پلٹ کر جواب دے دیتے تو یہ اتفاق تمہارے خلاف بھی جاسکتا تھا۔ تمہیں جو بھی ملا تمہارے صبر کے اجر میں ملا ہے اور بجائے خوش ہونے کے تم شکوک و شبہات میں پڑ کر اپنی حیات کا مزہ بھی کر کر رہے ہو۔ میرا یقین کرو، میری اس لڑکی سے ملاقات تو کیا، بات تک نہیں ہوئی۔“ میرا دل بیک وقت عبداللہ کی بات پر یقین کر بھی رہا تھا اور نہیں بھی۔ اتنے میں سلطان بابا کی آواز سنائی دی۔ ”کہاں چلے گئے تھے میاں ہمارا انتظار تو کیا ہوتا.....“ میں چونک کر پلٹا تو وہ سامنے ہی ہاتھ میں تنبیح لیے کھڑے تھے۔ گرم جوشی سے مجھے اپنے سینے سے لگایا اور گال تھپتھپائے۔ میں نے شرمندگی سے معذرت پیش کی۔ ”جب کھلاڑی ہار جائے تو اسے میدان میں کھڑے رہ کر کسی اشارے کا انتظار نہیں کرنا چاہئے۔ خود ہی میدان چھوڑ دینا چاہئے۔ اسی لیے آپ کا سامنا کئے بغیر ہی چلا گیا تھا۔ امید ہے آپ مجھے معاف کر دیں گے۔“ وہ خوش دلی سے ہنسنے لگے۔ ”ارے نہیں میاں، ناراضی کی تو کوئی بات ہی نہیں۔ یہ تو دل کا معاملہ ہے تم نے وہی کیا جو تمہارے دل نے کہا اور بھی یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ تم ہار گئے ہو۔ تمہاری فتح کی خبر بھی ہم تک پہنچ چکی ہے۔ آخری حیت تو تمہاری ہی ہوئی نا۔ تم نے جو چاہا، آخر کار اسے پالیا۔ جیتے رہو۔“ سلطان بابا میرا کاندھا تھپتھپا کر آگے بڑھ گئے۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے مزید شرمندگی سے بچانے کے لیے زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرے۔ گویا زہرا کے اقرار کی انہیں بھی خبر ہو گئی تھی۔ میرے ذہن میں عبداللہ کا مخصوص جملہ گونجا۔ ”جب جب جو جو ہونا ہے، تب تب سو سو ہوتا ہے.....“ لیکن میری

روح کو قہر کیوں نہیں مل رہا تھا؟ میرے اندر کی بے چینی لمحہ لمحہ بڑھتی کیوں جا رہی تھی؟ اور پھر جب عبداللہ نے مجھے یہ بتایا کہ وہ اور سلطان بابا ایک اہم مشن پر بہت جلد کسی دور دراز سفر پر نکل رہے ہیں، تو میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”تو پھر پیچھے درگاہ کا خیال کون رکھے گا؟“ ”مل ہی جائے گا کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ..... سنا ہے سلطان بابا نے کسی نئے عبداللہ کا انتخاب کر لیا ہے۔“ عبداللہ اپنی دھن میں گن مجھے بتاتا رہا۔ لیکن میرا دل تو یہ سن کر ہی ڈوب گیا کہ اب کوئی اور درگاہ کی رکھوائی کرے گا۔ نہ جانے اپنا نیت کا یہ کیسا احساس تھا کہ میں درگاہ پر کسی نئے عبداللہ کی آمد کا سن کر کچھ ایسے ہی بے چین ہو گیا، جیسے میری کوئی ذاتی جاگیر لوٹ کر لے جا رہا ہو۔

میں ٹوٹے ہوئے دل سے عبداللہ سے پھر ملنے کا وعدہ کر کے وہاں سے چلا آیا۔ لیکن پھر میرا دل کسی بھی کام میں نہیں لگ پایا۔ گھر پہنچا تو ایک نئی خبر میری منتظر تھی۔ زہرا نے اپنی والدہ کے ذریعے پیغام بکھجوا دیا تھا کہ وہ باقاعدہ رشتہ طے ہونے سے پہلے ایک بار مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ ملنا تو مجھے بھی اس سے تھا، کیوں کہ ہمارے رشتے پر چھائی ہوئی دھند چھٹنے کے بجائے بڑھنے لگی تھی۔ میں نے ملاقات کے لیے وہی جگہ تجویز کی جہاں سے یہ کہانی شروع ہوئی تھی اور اگلے دن شام ڈھلے ہم دونوں درگاہ کی سیڑھیوں سے کچھ فاصلے پر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ زہرا کی امی ڈرائیور سمیت اوپر درگاہ کی حاضری کو جا چکی تھی۔ آج وہ ناز آفرین اپنی جبین پر کوئی ٹسکن لیے بغیر، نظریں جھکائے میرے سامنے کھڑی تھی۔ کیا اب مجھے اپنی تقدیر سے کوئی گلہ باقی رہ جانا چاہئے تھا؟ پل بھر ہی میں میری نظروں کے سامنے اس پری کی ناراضی، دھتکار اور اس سے ہوئی آدھی ادھوری ملاقاتوں کے تمام مناظر گھوم گئے، لیکن آج وہ میرے سامنے اس بادشاہ کی طرح کھڑی تھی، جو میدان جنگ میں شکست کے بعد دوسرے شہنشاہ سے کہتا ہے کہ اس سے وہی سلوک کیا جائے، جو بادشاہوں کا شیوہ ہے۔ میں نے اس کی لرزتی پلکوں پر نظر ڈالی۔ ”میں آپ سے صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میرے اس فیصلے میں کسی ترمیم یا مزید جملے کی ملاوٹ نہیں ہے..... یہ میرا اپنا فیصلہ ہے۔ لیکن میرا ماضی بھی آپ کے سامنے پوری طرح عیاں ہے، لہذا اب فیصلہ آپ کا ہوگا۔ کیا آپ مجھے میرے ماضی سمیت قبول کر پائیں گے۔ میرا پچھلا جنوں کبھی طعن بن کر آپ کے لبوں پر تو نہیں آجائے گا؟ اپنے ظرف کے پیمانے کی وسعت جانچ کر ہی کوئی فیصلہ کیجئے گا۔ مجھے دونوں صورتوں میں آپ کی رائے سے اتفاق ہوگا.....“ اس نے ایک ہی پل میں ساری باتیں کر ڈالیں۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ میرے ظرف کا امتحان تو قدرت نے اسی دن سے لینا شروع کر دیا تھا، جب میں نے پہلی مرتبہ اسے دیکھا تھا۔ ”ظرف کا پیمانہ وسیع نہ ہوتا تو شاید ہم دونوں آج یوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے نہ ہوتے۔ لیکن میں آپ سے صرف ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ یہ رشتہ صرف تن پر حکمرانی تک رہے گا، یا پھر مجھے روح کا غلبہ بھی حاصل ہوگا.....؟“ میری بات سن کر وہ چونکی اور نظریں اٹھا کر مجھے یوں دیکھا، جیسے پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہو۔ اس کی وہ پہلی نظر تھی، جو صرف میرے لیے تھی، صرف ساحر کے لئے۔ اس کے لب ہلے۔ ”روح پر قبضہ پانے میں تو کبھی کبھی صدیاں بھی لگ جاتی ہیں۔ ساحر.....“ ”تو پھر میں مزید کئی صدیاں انتظار کرنے کے لیے تیار ہوں۔ کیا آپ میرے انتظار کی منزل تک میرا انتظار کر پائیں گی.....؟“ میری بات سن کر اس کا گلابی چہرہ کچھ اس طرح کھل گیا، جیسے سوچ اور تفکرات کے سبھی بادل ایک دم ہی چھٹ گئے ہوں۔ ”سوچ لیں، میرے پاس انتظار کے لیے زندگی بڑی ہے۔ لیکن کیا آپ روح سے روح کے رشتے کے لیے اتنا بڑا جوا کھیل پائیں گے۔ نتیجہ کچھ بھی ہو سکتا ہے؟“ ”نتیجہ جو بھی ہو، ہوگا تو آپ کی روح کا ہی..... اور میں اس دربار میں اپنا سر تسلیم ازل ہی سے خم کر چکا ہوں۔“ اس کے

پنکھڑی سے لیوں پر میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ ایک مسکراہٹ ابھرتی دیکھی، دنیا کی سب سے حسین مسکراہٹ۔ وہ کچھ دیر مجھے غور سے دیکھتی رہی۔ پھر دھیرے سے بولی۔ ”میری دعا کہیں سدا آپ کے ساتھ ہیں۔“ میں نے چونک کر اسے دیکھا، لیکن پھر وہ وہاں رک نہیں پائی اور سلام کر کے چل دی۔ اپنی تقدیر پر جتنا پیار مجھے اس لمحے آیا، شاید زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔

گھر واپسی پر جب میں نے ماما اور پاپا کو اپنا اور زہرا کا فیصلہ سنایا تو کچھ دیر کے لیے تو وہ دونوں ہی جیسے دنگ رہ گئے۔ پھر پہلے پاپا نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ ”ہمیں تم پر فخر ہے ساحر بیٹا اور ہم جانتے ہیں کہ تم ایک نہ ایک دن اس کی روح کو بھی فتح کر لو گے۔ گاڈ بلیس یو۔“ ہاں۔۔۔۔۔ شاید میں کبھی زہرا کی روح کو بھی جیت ہی لوں گا۔ لیکن ان دنوں خود میری روح جس عذاب سے گزر رہی تھی، میں اس کا بھلا کیا درماں کرتا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں اپنی آدھی روح کہیں اور چھوڑ آیا ہوں۔ آخر کار، اس رات میرے ضبط کے سارے پیانے پھٹک پڑے اور میں آدھی رات کو کمرے ہی میں سجدے میں گر کر رک گیا۔ ”یا میرے رب مجھے اس الجھن سے نکال دے۔ اگر میرا مقدر دنیا ہے تو مجھے مکمل دنیا کا کردے اور اگر میرا مقدر تیری نوکری ہے تو پھر مجھے پورا قبول کر لے۔“ یوں میری روح کے کوئل ریشوں کو تقسیم نہ کر۔ میں تیرا بہت نازک، بہت کمزور بندہ ہوں۔ مجھ پر اس دوراے کا اتنا وزن نہ ڈال۔ میری مشکل آسان کر دے۔“ نہ جانے کتنی دیر تک میں ہچکیاں لے لے کر روتا رہا اور پھر مجھے کب نیند آئی، مجھے خبر نہیں ہوئی۔ لیکن اس رات میرے ماں باپ سو نہ سکے۔ جانے رات کے کس پہر، پاپا کی آنکھ کھلی اور میری ہچکیوں کی آواز نے انہیں اپنی جانب متوجہ کیا۔ پھر کب وہ ماما کو بھی جگا کر میرے کمرے سے باہر آ کھڑے ہوئے۔ البتہ انہوں نے اس وقت میرے اور میرے خدا کے رابطے کے درمیان مغل ہونا مناسب نہیں سمجھا۔ صبح جب میں ناشتے کی میز پر آیا تو ان دونوں کے چہرے بھی آنسوؤں سے دھلے ہوئے محسوس ہوئے۔ آخر کار، ماما نے میرا ہاتھ چوم کر میری ہر کش کش کا فیصلہ کر دیا۔ مجھے رخصت کرتے وقت انہوں نے صرف ایک جملہ کہا۔ ”ساحر کاش میرے کئی بیٹے ہوتے اور سب تمہارے جیسے ہوتے۔ اب ہم بھی تمہارے اس سچ کے سفر میں تمہارے ساتھ ہیں۔ جہاں کہیں مستقل ٹھکانہ بناؤ ہمیں بھی بتا دینا۔ ہم بھی وہیں آ بیٹھیں گے۔“ میری زبان سے بے اختیار نکلا ”ہاں، لیکن زہرا کو اپنے ساتھ لے کر آئے گا۔“ وہ دونوں ہنس پڑے۔ اس بار ماما اور پاپا خود اپنی گاڑی میں مجھے درگاہ چھوڑنے کے لیے آئے اور پھر بہت دیر تک مجھے اپنے سینے سے لگا کر کھڑے رہے۔

جب میں آخری سیر می چڑھ کر درگاہ کے صحن میں پہنچا تو وہاں کا منظر ہی کچھ اور تھا۔ سبھی کسی جلدی میں نظر آ رہے تھے۔ جیسے کسی لمبے سفر کی تیاری ہو۔ میں نے قریب سے گزرتے ایک زائر سے احوال پوچھا تو اس کا جواب سن کر مجھے اپنی ذلوتی دنیا ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ”سلطان بابا درگاہ کا انتظام کسی نے خدمت گار کے سپرد کر کے خود کسی لمبے سفر پر جا رہے ہیں۔“ عبداللہ نے بتایا تھا کہ نئے عبداللہ کی تقرری ہو چکی تھی۔ میں نے مایوس ہو کر واپسی کے لیے قدم اٹھائے ہی تھے کہ اچانک ایک آواز نے میرا راستہ روک لیا۔ ”کہاں چل دیئے میاں، ابھی تو ٹھیک طرح سے آئے بھی نہیں۔“ میں پلٹا، وہ سلطان بابا ہی تھے۔ عبداللہ بھی ان کے پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ”شاید مجھے دیر ہو گئی ہے۔ آپ کو آپ کا خادم مل گیا ہے۔“ سلطان بابا نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”میاں جن کی ترقی ہو گئی ہو، انہیں ہم دوبارہ درگاہ کی خدمت پر نہیں لگاتے۔ تم ہمارے ساتھ چل رہے ہو۔“ خوشی اور حیرت کے مارے میری حالت پر سبھی مسکرا دیئے۔ ”عبداللہ میاں اب ہمارے ساتھ نہیں جا رہے۔ انہیں ہم نے کسی اور جگہ کی خدمت کے

لیے بھیجتا ہے۔ ساحر تم ہمارے ساتھ چل رہے ہو۔ بولو کیا ارادہ ہے۔“ ”زبے نصیب..... لیکن درگاہ کی خدمت کے لیے بھی تو کسی کو یہاں رہنا تھا، وہ کہاں ہے؟“ دفعۃً عبداللہ کے پیچھے نعمان کا چہرہ ابھرا۔ ہاں وہی کھلنڈ راساموٹر سائیکل سوار نعمان۔ وہ تیزی سے بڑھ کر میرے گلے لگ گیا۔ ”میں یہاں رہوں گا، آپ بے فکر ہو کر جائیں۔“ سلطان بابا نے کاغذ کی ایک چٹ میرے ہاتھ میں تھمائی اور پلٹ کر جاتے ہوئے بولے۔ ”اس نوجوان کو اس کے نئے نام سے آگاہ کر کے چلے آؤ، ہمیں شام ڈھلنے سے پہلے بہت لمبا سفر طے کرنا ہے۔“ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کاغذ کھولا..... کاغذ پر نیا نام جگمگا رہا تھا۔ ”عبداللہ“ میں نے نعمان سے مل کر اور اسے ساری تفصیل سمجھا کر سلطان بابا کے پیچھے چل پڑا۔ میری زندگی کا نیا سفر شروع ہو چکا تھا اور ہماری منزل کہاں تھی، یہ صرف سلطان بابا ہی جانتے تھے۔ میں نے ڈوبتے سورج کی سنہری روشنی میں دور ساحل پر کھڑے ہو کر درگاہ کی جانب پلٹ کر دیکھا۔ ایک نیا ”عبداللہ“ درگاہ کی منڈیر پر کھڑا ہمیں الوداع کہہ رہا تھا۔ میں نے دھیرے سے ہاتھ اٹھایا اور میرے دل نے کہا ”الوداع“



کالا پانی

ہمیں سفر کرتے تین دن ہو چکے تھے۔ جانے یہ کیسا سفر تھا، جس کے راہبر نے کچھ کہا، نہ پیر و کار ہی نے کچھ پوچھنے کی جسارت کی۔ میں سلطان بابا کے نقش قدم پر چلتا، ان کے پیچھے پیچھے روانہ تھا۔ ساحلی پٹی ختم ہوئی تو سلطان بابا نے مرکزی شاہراہ سے پہلے بس لے لی۔ دوسرے دن بس نے ہمیں ایک ویران ریلوے اسٹیشن پر پہنچا دیا۔ جہاں سے رات کی واحد پہنچن ٹرین کچڑ کر ہم پہاڑوں سے گھری ایک وادی کے چھوٹے سے اسٹیشن پر اگلی رات تک پہنچے تھے۔ رات سلطان بابا نے وہیں اسٹیشن ہی پر بسر کی اور پھر فجر کی نماز پڑھتے ہی ہم دوبارہ بیدل ہی قریبی قصبہ کو جاتی۔ مرکزی سڑک پر چل پڑے۔ اس وقت سورج ٹھیک ہمارے سروں پر تیز کونوں کی برچھیاں چھو رہا تھا۔ میں نے پورے سفر میں سلطان بابا کو بلا ضرورت بولتے نہیں دیکھا تھا۔ پورا رستہ وہ چپ ہی سادھے رہے، لیکن ان کی خاموشی میں بھی ایک طرح کی گفتگو تھی۔ جب کبھی مجھے تھکن کا احساس ہوتا، یا میرے من میں کوئی سوال ابھرتا، اسی لمحے وہ پلٹ کر مسکراتی نظروں سے میری جانب دیکھ لیتے اور میرے ہر سوال کو جیسے ایک جواب سائل جاتا اور تھکن جانے کہاں اڑ جاتی۔ کتنی عجیب بات تھی۔ کچھ لوگوں کی خاموشی بھی بولتی ہے اور کچھ لوگ بول کر بھی گو لگے رہتے ہیں۔

شام تک آسمان کو کالی گھٹاؤں نے پوری طرح ڈھک لیا اور پھر مغرب سے ذرا پہلے شدید اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ان پہاڑی علاقوں کی بارش کے بارے میں سنا تو بہت تھا کہ پل بھر ہی میں سب جل تھل کر دیتی ہے، لیکن تجربہ آج پہلی بار ہو رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ایک چھوٹی سی آبادی کے آثار دکھائی دینا شروع ہوئے اور قصبہ کی پہلی سڑک پر مڑتے ہی ایک چھوٹے سے پہاڑی ٹیلے پر بنی ہوئی ایک خستہ حال مسجد کے گنبد نظر آنے لگے۔ میں اور سلطان بابا پوری طرح بھیگ چکے تھے اور جب ہم مسجد کے کچی اینٹوں سے بنے ہوئے گھن میں داخل ہوئے تو موزن مغرب کی اذان کے لیے کھڑا ہو چکا تھا۔ اذان ختم کرتے ہی وہ والہانہ انداز میں کچھ اس طرح سلطان بابا کی جانب بڑھا جیسے اس کی، ان سے برسوں سے جان پہچان ہو۔ سلطان بابا نے میرا تعارف ”عبداللہ“ کے نام سے کروایا۔ کچھ ہی دیر میں مسجد میں قریباً درجن بھر نمازی جمع ہو گئے اور سلطان بابا ہی کی معیت میں جماعت ادا کی گئی۔ نماز کے بعد موزن کے سوا تمام نمازی ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ موزن کا نام رشید تھا۔ جس نے نمازیوں کے جانے کے بعد جلدی سے ہم دونوں کو گرم گرم قبوہ پیش کیا۔ میں نے ابھی قبوے کا پہلا گھونٹ ہی لیا تھا کہ سلطان بابا کا سوال سن کر میرے ہاتھ سے پیالہ قریباً چھوٹ ہی گیا ”پچانسی کب ہے؟“ رشید سے مخاطب تھے۔ رشید نے اسی طرح سر جھکائے جواب دیا۔ ”پرسوں صبح..... ساڑھے چار بجے۔“ سلطان بابا نے لبہا سے ہنکارا بھرا ”ہوں..... گویا ہمارے پاس اڑتالیس گھنٹے سے بھی کم ہیں..... چلو خیر، جو اللہ کو منظور۔“ میں حیرت سے سلطان بابا اور رشید کو دیکھ رہا تھا۔ یہ پچانسی کا ذکر ہو رہا تھا اور اڑتالیس گھنٹوں میں ایسا کیا ہونے والا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے خود کو کوئی سوال کرنے سے روکا۔ کچھ ہی دیر میں مسجد کے باہر ایک سرکاری چپ آ کر رکی اور پھر اندھیرے میں اس کی چمکتی لائٹس کی روشنی میں پانی سے شرابور، کچھڑ میں چھپ

چھپ کرتے بڑی بڑی خاکی برساتیوں میں ملبوس چند سرکاری اہل کار تھے۔ ان میں سے ایک بارعب اور عمر رسیدہ شخص، جوان سب کا آفیسر تھا، چھتری کے سائے تلے تیزی سے چلتا ہوا مسجد کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ اس کے سر پر چھتری تانے ہوئے ایک اہل کار تقریباً دوڑتا ہوا، اپنے افسر کو پانی کے ریلوں سے بچانے کے لیے ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا۔ رشید نے جلدی سے اٹھ کر افسر کا استقبال کیا۔ ”آئیے آئیے جیلر صاحب۔۔۔۔۔ سلطان بابا آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔“ آنے والے کا نام اقبال تھا اور پتا یہ چلا کہ وہ اس قصبے کی مرکزی جیل کا سپرینٹنڈنٹ ہے۔ وہ سلطان بابا سے پہلی مرتبہ مل رہا تھا، لیکن اس کے انداز و اطوار میں بھی پرانے شناساؤں جیسا احترام تھا، البتہ اس کے چہرے سے پریشانی کے آثار جھلک رہے تھے۔۔۔۔۔ ابتدائی علیک سلیک کے بعد جب رشید نے جیلر اقبال کو بھی قہوے کا پیالہ پیش کر دیا تو سلطان بابا نے حتمی سوال کر ڈالا۔ ”ہاں بھی جیلر صاحب۔۔۔۔۔ جم تو حاضر ہو گئے آپ کے بلاوے پر۔۔۔۔۔ اب فرمائیے کیا حکم ہے؟“ میں نے حیرت سے سلطان بابا کی طرف دیکھا، تو گویا تین دن کے اس لمبے سفر کا مقصد اس جیلر کا بلاوا تھا۔ اقبال نے عاجزانہ انداز میں جواب دیا۔ ”آپ اتنی دور سے صرف میرے بلاوے پر یہاں تک آئے یقین جانیے، یہ میرے لیے بہت اعزاز کی بات ہے۔ دراصل پریشانی ہی کچھ ایسی تھی کہ آپ کو تکلیف دینی پڑی۔ آپ کو رشید نے بتا دیا ہوگا کہ پرسوں صبح میری جیل میں ایک پھانسی کی تیاری ہے۔ ایک ایسے جیلر کی حیثیت سے، جو تقریباً ۲۵ سال کی سروس مکمل کر چکا ہو، یہ پھانسی ایک معمول کی بات ہونی چاہئے، لیکن آپ کو یہ سن کر شاید حیرت ہو کہ میری کسی بھی بڑی سینئرل جیل میں یہ دوسری تعیناتی ہے۔ اس سے پہلے تقریباً دو سال تک سندھ کی ایک بڑی جیل میں رہ چکا ہوں، لیکن آپ اسے قدرت کی مہربانی کہیں، یا مقدر کا ستم کہ میں نے اپنی پوری سروس میں کبھی کوئی پھانسی نہیں بھگتائی اور پرسوں دی جانے والی پھانسی نہ صرف میری سروس، بلکہ میری زندگی کی بھی پہلی پھانسی ہے۔۔۔۔۔“

ہم تینوں نے چونک کر جیلر کی جانب دیکھا، جو سر جھکائے اپنی زندگی کی شاید سب سے بڑی الجھن بیان کر رہا تھا۔ اقبال نے ہمیں بتایا کہ رحیم پور کے جس قصبے میں اس وقت ہم سب موجود تھے وہیں ملک کی سب سے بڑی اور شاید سب سے پرانی مرکزی جیل بھی واقع تھی، جس میں ملک بھر سے سنگین ترین جرائم کے قیدی بھیجے جاتے تھے، جن میں زیادہ تر سزائے موت ہی کے قیدی ہوتے۔ اس جیل کے پہاڑوں میں گھرے محل وقوع اور شدید سخت اور کڑے پہرے کی وجہ سے اسے دوسرے ”کالے پانی“ کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ سنا تھا کہ انگریز کے زمانے سے لے کر اب تک یہاں سے صرف دو مرتبہ قیدیوں نے نفع لگا کر بھاگنے کی کوشش کی اور دونوں مرتبہ ہی تین اور پانچ کے دو قیدی گروہ، جیل کی فصیل تک پہنچنے سے پہلے ہی اونچی برجی پر کھڑے جیل کے محافظوں کی گولیوں کا شکار ہو کر مارے گئے۔ اس کے بعد آج تک کسی قیدی کو یہ جرأت نہیں ہوئی کہ وہ اس کالے پانی کی قید سے فرار کا سوچ بھی سکے۔ اقبال جیلر کی سروس کا یہ آخری سال تھا اور رحیم پور کی جیل میں اس کی تعیناتی کو ابھی بمشکل ڈیڑھ ماہ کا عرصہ ہی ہوا تھا، لیکن حاضری کے فوراً بعد اسے جس سرکاری حکم کا پہلا پروانہ موصول ہوا، وہ اسی سکندر نامی قیدی کی پھانسی تھا۔ بقول جیلر، اسی دن سے اس کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں۔ پہلے پہل تو اس نے خود کو یہ کہہ کر قتل ہی دے دی تھی کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل بھی سینئر اور تجربہ کار افسر ہے، لہذا اس کی موجودگی میں پھانسی کسی نہ کسی طرح نپٹا ہی دی جائے گی۔ لیکن شومی قسمت، ڈپٹی کے داماد اور بیٹی کا ساہیوال میں ایک خطرناک ایکسیڈنٹ ہو گیا اور ڈپٹی کو چار دن پہلے ہی انتہائی غلٹ میں چھٹی لے کر جانا پڑ گیا اور فی الحال اگلے چند روزہ دن تک اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ جیلر کی دوسری امید جیل کا سرکاری ڈاکٹر تھا،

جیسے اس پھانسی کے تمام عمل میں اور تمام تیاریوں اور انتظامات میں جیلر کی معاونت بھی کرنی تھی۔ لیکن جیلر کے یہ سن کر تو ہوش اڑ گئے کہ ڈاکٹر نے ابھی دو سال پہلے اپنا ہاؤس جاب مکمل کیا ہے اور کسی بھی جیل میں یہ اس کی پہلی تعیناتی ہے۔ ڈاکٹر کے تو پہلے ہی یہ سوچ کر ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے کہ ایک زندہ انسان کو اس کی نظروں کے سامنے چلا کر لایا جائے گا اور پھر اس کی سانسیں سلب کر لی جائیں گی۔ بقول نوجوان ڈاکٹر ”کسی مریض کو اپنے سامنے دم توڑنا دیکھنے میں اور ایک انسان کو پھانسی پر لٹکا دیکھنے میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔“ یہ سب کچھ بتاتے ہوئے بھی اقبال کے چہرے پر ہواکیاں سی اڑ رہی تھیں۔ اس کی پریشانی بھی اپنی جگہ بجا تھی، کیوں کہ ملک کی سب سے بڑی جیل کا سپرنٹنڈنٹ ہونے کے ناطے اس پر بہت بھاری ذمہ داری عائد ہوتی تھی اور اگر اس سارے پھانسی کے عمل میں کوئی بھی قانونی، یا اخلاقی سقم باقی رہ جاتا تو اس کی تمام تر جواب دہی اس کو کرنا تھی۔ سلطان بابا نے بہت غور سے جیلر کی بات سنی اور پھر ہلکے سے کھٹک کر گویا ہوئے ”واقعی یہ تو بڑی پریشانی کی بات ہے۔ تو پھر آپ نے اس مشکل کا کیا حل نکالا۔ ویسے آپ تو خود کافی تجربہ کار ہیں۔ آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ جیل کا جلا دیسے موقعوں پر کافی کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ کیا آپ نے جلا دیسے کوئی مدد نہیں لی۔۔۔۔۔ کبھی کبھی ان پڑھ ہوتے ہوئے بھی وہ بہت سی ایسی باریک ٹیکنیکی تفصیلات جانتا ہے، جو کسی بھی بڑے افسر کے لیے انتہائی کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں۔“ اقبال نے بے چینی سے ہاتھ ملے ”اب آپ کو کیا بتاؤں۔۔۔۔۔ جلا دیسے پوسٹ پچھلے آٹھ مہینے سے خالی ہے۔ پرانا جلا دیسے ریٹائر ہوا تو حسب معمول جلا دیسے تعیناتی کے لیے حکام بالا سے اجازت لے کر اخبارات میں اشتہار روئے دیا گیا کہ جیل میں جلا دیسے کی جگہ خالی ہے، لیکن کسی نے بھرتی کے لیے درخواست ہی جمع نہیں کروائی۔ حتیٰ کہ پرانے جلا دیسے بیٹے کو تو ہم نے پیش کش بھی کی تھی کہ اگر وہ اپنے باپ کی جگہ بھرتی ہونا چاہے تو ہم محکمے سے خصوصی اجازت لے کر بنا کسی ٹیسٹ، یا انٹرویو کے اسے براہ راست بھرتی کر لیں، لیکن وہ دس جماعت پڑھ چکا ہے اور اس نے صاف انکار کر دیا کہ وہ یہ کام نہیں کرنا چاہتا۔ ویسے اب غیر مسلم بھی اس کام سے کتراتے لگے ہیں۔ پہلے تو زیادہ تر جیلوں کے جلا دیسے مسلم ہی ہوا کرتے تھے، لیکن اب اس بے روزگاری کے باوجود بھی کوئی اس پیشے سے منسلک ہونا پسند نہیں کرتا۔ دراصل موت کے تختے کا لیور کھینچنے کے لیے بڑا دل گردہ چاہئے ہوتا ہے جناب۔۔۔۔۔ صبح ہونے سے پہلے کارات کا سنا بنا ہوا لوناک ہوتا ہے اور اس سنائے میں لیور کی چرچراہٹ اور تختے کھٹکنے کا کھڑاک بہت سے کمزور دل حضرات کا پتا پانی کر سکتا ہے۔۔۔۔۔ اور پھر ان سب سے بڑھ کر قیدی کی گردن کا منکا علیحدہ ہو کر ٹوٹنے کی وہ بے رحم چٹختی ہوئی آواز۔۔۔۔۔“ جیلر کی بات سن کر موزن رشید کو جھرجھری سی آ گئی۔ اقبال بظاہر ہمیں پھانسی کی تفصیلات بتا رہا تھا، لیکن اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بار بار اس لمحے کا ذکر کر کے دراصل اپنے لاشعور میں چھپے کسی خوف کو دور کرنا چاہتا ہے، جو اندر ہی اندر جانے کب سے اسے ڈسے جا رہا تھا۔

مجھے یاد تھا کہ کالج پاس کرنے کے بعد میرے بہت سے دوست، جو پری میڈیکل گروپ سے وابستہ تھے، انہوں نے میڈیکل کالج میں داخلہ لیا تو میں اور کاشف بہت عرصے تک اپنے پرانے کلاس فیلوز سے ملنے کے لیے ان کے ہاسٹلز جاتے رہے تھے، جس کا نام چیورپورڈنس (Jurisprudence) تھا۔ میں نے ہاسٹل کی ان ملاقاتوں کے فارغ التحصیلوں میں اس کتاب کے بہت سے باب یونہی پڑھ ڈالے تھے۔ یہ مضمون طب کے مختلف کینسر سے متعلق تھا اور اس میں جرم اور سزا کے باب میں پھانسی کا بھی تفصیلاً ذکر موجود تھا۔ مجھے وہ کتاب پڑھتے ہوئے کئی مرتبہ ایک عجیب سا احساس بھی ہوا کرتا کہ پھانسی جیسا عمل، جس کے متعلق سوچ کر ہی رو گئے کھڑے ہو جاتے ہیں، سزا کی اصطلاح میں وہ بھی ایک بے حد میکائیکل سا

عمل ہے۔ حتیٰ کہ مجھے یہ بھی یاد تھا کہ میں نے اس ہی طب کے رسالوں میں کہیں ”بہترین پھانسی“ کی اصطلاح بھی پڑھی تھی۔ طب کے میدان میں اور سزا کی دنیا میں بہترین پھانسی کا تصور یہ تھا کہ قیدی کی گردن کا منکا پہلے ہی جھٹکے میں یوں ٹوٹ جائے کہ اسے زیادہ ”تکلیف“ کا سامنا نہ کرنا پڑے حالانکہ اس ایک جھٹکے میں بھی سانس کی ڈور ٹوٹنے کے باوجود قیدی کم از کم آٹھ سے دس منٹ تک سولی پر لٹکتا ہوا چھوڑ دیا جاتا تھا، کیونکہ اس دوران بھی وہ دماغی طور پر (طب کی اصطلاح میں) زندہ رہتا تھا اور اس کی مکمل ”دماغی موت“ کے لیے یہ آٹھ منٹ کا وقفہ ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اس دوران قیدی کی نرپ اور بے چینی جاری رہتی تھی اور اس کا کلیہ بھی اسی کتاب میں درج تھا کہ جب تک پھانسی کا رسہ خفیف سی حرکت یا جھول کھاتا رہے، تب تک یہ سمجھنا چاہئے کہ قیدی میں زندگی کی چنگی بھرمق باقی ہے۔ لیور کھینچنے تختہ کھلنے اور قیدی کے جسم کے مکمل بوجھ کے رے سے لٹک کر جھولنے کے اولین لمحے سے لے کر رے کے مکمل سکوت میں آنے تک کے آخری لمحے کا درمیانی وقت آٹھ منٹ سے لے کر دس منٹ تک محیط ہو سکتا تھا اور اسی درمیانی وقت کو قیدی کے لیے کم سے کم اذیت ناک بنانے کے لیے جیل حکام کا فرض بنتا تھا کہ وہ قیدی کے لیے ایک ”بہترین پھانسی“ کا انتظام کریں اور اس تیاری اور نظام کی جزئیات کچھ اس طرح تھیں کہ قیدی کے وزن کے حساب سے رسہ تیار کیا جائے۔ اس میں بنایا گیا جھنڈا، رے کی لمبائی اور رے کی ساخت کا تناسب بہترین ہونا چاہئے۔ رسہ ہمیشہ قیدی کے اس وزن کے مطابق تیار کیا جاتا تھا، جو پھانسی سے ایک دن قبل آخری میڈیکل چیک اپ کے وقت قیدی کا ہوتا ہے۔ اسی طرح جلاؤ کی ڈیوٹی میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ ایک دن پہلے تختہ دار کے قفسے وغیرہ جانچ لے کر تختہ کے کھلنے میں کسی قسم کی دشواری تو نہیں؟ لیور کا پینڈل ٹھیک کام کر رہا ہے کہ نہیں؟ عین وقت پر لیور، یا تختہ کسی رکاوٹ کی وجہ سے جواب تو نہیں دے جائیں گے؟ تختے کے دونوں پٹ ایک جھٹکے سے اور ایک ساتھ کھل رہے ہیں، یا نہیں؟ تختے کے قبضوں کو گزشتہ ایک ہفتے کے دوران ٹھیک طرح سے تیل پلایا گیا ہے، یا نہیں؟ کہیں رے کی رگڑ، یا لکڑی، لوہے کی ستون کی کوئی ناہموار سطح رسہ کاٹنے، یا ٹوٹنے کا باعث تو نہیں بن جائے گی؟ ایسے ہی نہ جانے کتنے درجنوں سوال تھے، جن کا جواب جلاؤ اور جیل کے عملے کو مل کر ڈھونڈنا ہوتا تھا، تب ہی کہیں جا کر کوئی پھانسی ”بہترین پھانسی“ کہلائی جاتی تھی اور ان سب باتوں کی براہ راست نگرانی اور ذمہ داری جیل سپرنٹنڈنٹ کی ہوتی، اسی لیے اقبال ہمارے سامنے پریشان سی صورت لے کر بیٹھا تھا۔

اس کے پاس بمشکل چالیس، یا بیالیس گھنٹے تھے اور شاید وہ ابھی تک پوری طرح پھانسی گھاٹ ہی تیار نہیں کروا پایا تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ہم انسان بیک وقت کتنے نرم خور اور کتنے سنگ دل ہو سکتے ہیں۔ معاشرے کو چلانے کے لیے ہمیں کیسے کیسے دہرے معیار اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ گھر میں پالے ہوئے اپنے کسی پالتو جانور کی ذرا سی تکلیف پر بے چین ہو جانے والے انسانوں کو کبھی کبھی اس بات کے لیے سر جو کر بیٹھنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے جیسے جیتے جاگتے انسان کی جان لینے کا کون سا طریقہ اختیار کریں۔ بظاہر اقبال کی پریشانی بے جا ہی تو تھی۔ جب ایک انسان کی سانس کی ڈور کا کٹنا ہی مقدر ٹھہر تو پھر اس میں اتنے تردد کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ عملہ پورا تھا، یا نہیں، انتظامات میں کمی بیشی ہوئی بھی تو کیا؟ جان لینے کے لوازمات معیار کے مطابق تھے، یا غیر معیاری۔ بھلا ان باتوں سے اس سیاہ نصیب قیدی کی قسمت پر کیا فرق پڑنے والا تھا۔ مقصد تو اس کی جان لینا تھا، پھر بھلا وہ تلوار سے سرمقم کر کے لی جائے، یا گولی، یا پھانسی کے پھندے پر لٹا کر..... کیا فرق پڑتا تھا۔ ایک لمحے کو تو مجھے اقبال کی ساری باتیں، وہ طوفانی بارش میں بھیگنا سیاہ سناٹا اور بوندوں سے بھیگتے ہمارے وجود..... سبھی کچھ ”ایک بہت بڑا جھوٹ“ لگنے لگا تھا۔ جیسے ہم سب اس نظام کی

کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے لیے ڈھکوسلا کر رہے ہوں اور کچھ ہی دیر بعد ہم سب اطمینان سے یہ کہتے ہوئے کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوں گے کہ ہم نے اپنے طور پر تو پوری کوشش کر دیکھی، لیکن کیا کریں پورا سسٹم ہی خراب ہے تو اس میں اب ہمارا کیا قصور؟ لیکن بے چارہ جیلر بھاگ دوڑ پر مجبور کر رہا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے قیدی کی جان لینے سے پہلے تمام قواعد و ضوابط تو پورے کرنے ہی ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے اندر سے بھی کبھی نہ کبھی یہ آواز اٹھی ہوگی کہ ”کس جھنجھٹ میں پڑ رہے ہو میاں..... چڑھا دو سولی۔ یہاں اس ویرانے میں کس نے آکر یہ قواعد و ضوابط دیکھنے ہیں۔ ختم کرو یہ منٹا۔“ لیکن افسوس..... فطرت ہمیں اس گناہ سے بھی پوری طرح لطف اندوز نہیں ہونے دیتی جو صرف ہمارے اندر ہی جنم لیتا ہے اور اندر ہی کہیں فنا ہو جاتا ہے۔ کبھی وفا، کبھی بھرم اور کبھی فرض شناسی جیسے۔ ”درا انداز جذبے“ ہمارے اس معصوم گناہ کا مزہ بھی کر کر اکر کرنے کے لیے جانے کہاں کہاں سے جنم لینے لگتے ہیں۔ جیلر بھی اس وقت ایسے ہی ایک معصوم گناہ اور ایک بے رحم ثواب کے بیچ چلتی جنگ کے درمیان پس رہا تھا اور وقت اس کی بند مٹھی سے ریت کی طرح پھسلتا جا رہا تھا۔

سلطان بابا نے کچھ دیر تک ساری صورت حال پر غور کیا اور پھر جیلر سے مخاطب ہوئے ”واقعی صورت حال تو کافی گمبیر ہے، لیکن جلاوکی عدم موجودگی میں یہ فریضہ اب کون سا انجام دے گا۔“ اقبال نے لمبی سی سانس بھری۔ ”ویسے تو میں نے دو ہفتے پہلے ہی حکام کو جلاوکی عدم دستیابی کا پروانہ لکھ دیا تھا اور انہوں نے ایک دوسرے قریبی ضلع کی سینٹرل جیل کے جلاو کو بذریعہ آرڈر پابند بھی کر دیا ہے کہ وہ میری جیل میں حاضر ہو کر مجھے ۲۸ گھنٹے پہلے رپورٹ کرے اور اس پچاسی کو تکمیل تک پہنچائے۔ لیکن ابھی تک تو وہ پہنچا نہیں، شاید صبح والی گاڑی سے پہنچ جائے۔ دراصل اس شدید طوفان اور موسلا دھار بارش نے چند گھنٹوں ہی میں بڑی تباہی مچا دی ہے۔ ابھی جب ہم آپ کی طرف آ رہے تھے تو مجھے وائرلیس سیٹ پر اطلاع ملی کہ قصبہ کویر وئی دنیا سے جوڑنے والی سڑک کا واحد پل بھی پانی سے بہہ گیا ہے اور ریلوے ٹریک بھی ایک آدھ گھنٹے کے بعد قابل استعمال نہیں رہے گا، کیونکہ ابھی سے قریب آدمیل پٹری کا کلکڑا گھنٹوں گھنٹوں پانی میں ڈوب چکا ہے۔“

آسمان پر بادل زور سے گرے اور دور کسی ویرانے میں بجلی کا کوند اس زور سے لپکا کہ کچھ دیر کے لیے ہم سبھی نیلی روشنی میں نہا سے گئے۔ میں نے اس لحاقی روشنی میں جیلر کے ماتھے پر بارش کی بوندوں کے ساتھ پسینے کی چند بوندیں بھی چپتی دیکھیں اور پھر اگلے ہی لمحے پھر سے وہی گھپ اندھرا چھا گیا۔ سلطان بابا دھیرے سے مسکرائے۔ ”جیلر صاحب لگتا ہے قدرت بھی آپ کی اس زمینی عدالت کے فیصلے کو ماننے پر تیار نہیں ہے۔ ارے ہاں! آپ نے یہ بتایا ہی نہیں کہ آخر ہمیں یہاں بلانے کا کیا مقصد تھا۔ کیوں کہ آپ کی تمام بیان کردہ مجبوریاں اپنی جگہ، لیکن ظاہر ہے کہ یہ سارے سرکاری کام ہیں اور ان میں ہمارا کوئی عمل دخل نہیں ہو سکتا۔“ اقبال کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ سلطان بابا کی بات سن کر چونک اٹھا۔ ”جی، بالکل..... آپ نے بجا فرمایا۔ دراصل آپ کو زحمت دینے کی وجہ بھی وہی قیدی سکندر ہی ہے۔ اس کی آخری خواہش ہے کہ مرنے سے پہلے اس کی آپ سے ملاقات کروادی جائے۔“ میں نے اور سلطان بابا نے بیک وقت چونک کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔



آخری انتظار

آسمان پر بجلی زور سے چمکی، تیز طوفانی ہوائ نے کچھ پل کے لیے برسات کی بوچھاڑ کا رخ ہماری جانب کر دیا اور ہم سب، جو پہلے ہی مسجد کے برآمدے میں تقریباً دیوار سے لگے بیٹھے تھے، ایک دفعہ پھر بھیگ کر مزید دیوار کے ساتھ چپک گئے۔ سلطان بابا نے حیرت سے جیلر کی جانب دیکھا۔ ”آپ کے قیدی کی آخری خواہش یہ ہے کہ اس سے میری ملاقات کروادی جائے..... لیکن ان آخری لمحات میں تو ہر قیدی اپنے خاندان، اپنے پیاروں سے ملاقات کا خواہش مند ہوتا ہے، پھر اس نے ایک اجنبی سے ملنے کی خواہش کیوں ظاہر کی؟“ اقبال نے اپنی برساتی پر جمع ہوئی بوندوں کو جھاڑا ”قیدی کا اس دنیا میں اور کوئی رشتہ باقی نہیں رہا..... کم از کم اس کا دعویٰ تو یہی ہے۔ لیکن اگر آپ اس کے لیے اجنبی ہیں تو پھر یہ سوال البتہ اب بھی باقی ہے، ہو سکتا ہے آپ سے ملاقات کے بعد اس راز سے بھی پردہ اٹھ جائے۔“ جیلر نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ اس نے اپنی پوری ملازمت میں موت کا ایسا عجیب قیدی نہیں دیکھا، جو اپنی زندگی بچانے کی اپیل کے حق میں بھی نہیں۔ نہ ہی اس نے گزشتہ آٹھ مہینے میں، جب سے اسے اس جیل میں لا کر موت کی کال کوٹھڑی میں ڈالا گیا ہے، کسی بھی قسم کی کوئی فرمائش، یا شکایت کی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ خود ایک ایک دن گن کر اپنی موت کا انتظار کر رہا ہے۔ گویا موت نہ ہوئی، اس کی ”محبوبہ“ ہو گئی۔ جیل کے گزشتہ ریکارڈ سے اقبال کو یہ بھی پتا چلا کہ سکندر نامی اس قیدی نے معمول کے لیے کی جانے والی رحم کی کسی اپیل پر بھی دستخط نہیں کئے تھے، ورنہ کم از کم صدر مملکت کو کی جانے والی اپیل کے فیصلے تک اس کی سانسیں بڑھ سکتی تھیں اور اس کی کم عمری کو دیکھتے ہوئے اس بات کا بھی قوی امکان تھا کہ شاید اس کی سزائے موت رحم کھا کر ”عمر قید“ میں بدل دی جاتی۔ وہ سارا دن چپ چاپ رہتا تھا اور شام سے قبل، جب کال کوٹھڑیوں کے قیدیوں کو آدھے گھنٹے کے لیے زندان سے باہر ”ٹہلائی“ کے لیے نکالا جاتا تھا اس دوران بھی وہ خاموشی سے ایک جانب بیٹھا رہتا۔ شاید ہی کسی قیدی، یا جیل کے عملے نے اسے بلا ضرورت کبھی بولنے دیکھا ہو۔ شروع شروع میں جب اسے اس جیل میں لایا گیا تھا تب سی آئی ڈی (CID) والے روزانہ اس سے تفتیش کے لیے جیل آتے تھے..... سنا ہے اس کا تعلق ایک بہت خطرناک ملک دشمن تنظیم سے تھا اور اس قیدی کے سینے میں بھی بہت سے ایسے راز دفن تھے جو اگر صحیح وقت پر افشا ہو جاتے تو بہت بڑی تباہی سے بچا جاسکتا تھا، لیکن سکندر کی زبان کھلنا تھی، نہ کھلی۔ اس پر ملک کے ایک نوجوان اور ابھرتے ہوئے سائنس دان کے قتل کا جرم ثابت ہو چکا تھا اور اسی جرم کی پاداش میں وہ آنے والی موت کے انتظار میں اس کال کوٹھڑی میں پڑا، ایک ایک گھڑی گن رہا تھا۔ جیلر ابھی ہمیں یہ ساری تفصیلات بتائی رہا تھا کہ دور جیل کے گھنٹہ گھر سے گیارہ مرتبہ ٹن، ٹن، ٹن..... کی سی آواز سنائی دی۔ جیل میں قیدیوں اور دیگر عملے کو وقت سے مطلع رہنے اور ہوشیار رہنے کے لیے ایک بہت بڑی سی جیل کی گھنٹی کو ہر گھنٹے کے بعد اتنی ہی مرتبہ لوہے کی ایک بہت بڑی راڈ کے ذریعے بجایا جاتا تھا۔ جتنی مرتبہ گھنٹی بجتی، وہی دن، یا رات کا وقت ہوتا۔ مطلب یہ کہ اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ اب ساڑھے گیارہ بجے یعنی آدھے گھنٹے کے بعد صرف ایک ”ٹن“

کی آواز یہ ظاہر کرے گی کہ رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں۔ یہ ساری تفصیل بھی ہمیں جیلر کی زبانی ہی پتا چلی۔ جیلر نے اپنے پاس کھڑے جیل کے حوالدار سے کہا۔ ”جا کر پتا کرو، دارالحکومت سے جس افسر نے آنا تھا، اس کی کوئی خبر نہ پہنچی، یا نہیں..... میری جیب کے وارنٹس ہی سے قصبے کے باہر والی چوکی کو بھی مطلع کرو کہ اگر وہ لوگ پل کی دوسری جانب پہنچ گئے ہیں تو محکمہ انہار والوں سے کہہ کر کشتی کا انتظام کروائیں اور ندی پار کروا کر جیل کے ریسٹ ہاؤس میں پہنچا دیں۔ میں کچھ دیر میں جیل پہنچتا ہوں.....“ حوالدار کچھ ہنچا پھلا۔ ”لیکن جناب..... ریسٹ ہاؤس میں تو صرف ایک ہی کمرہ کچھ استعمال کے قابل تھا اور اس میں مقتول کی بیوہ، اپنے پانچ سالہ بیٹے کے ساتھ شام ہی سے آپ کے حکم کے مطابق ٹھہرائی گئی ہے..... پھر بھی اگر آپ کہیں تو.....“ جیلر نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر یوں سر جھٹکا، جیسے اسے خود اپنے بھلکدہ پن پر غصہ آ رہا ہو۔ ”اور ہاں..... یاد آ یا..... اچھا ٹھیک ہے، ان کے لیے میرے گھر کا مہمان خانہ تیار کروادو..... بیوہ کو وہیں ریسٹ ہاؤس میں رہنے دو..... اب اس برستی رات میں وہ بے چاری کہاں کمرے تبدیل کرتی پھرے گی.....“ حوالدار سر ہلا کر جلدی سے مسجد کے باہر کھڑی جیب کی جانب بڑھ گیا۔

ہمارے کسی سوال سے پہلے ہی اقبال نے خود ہمیں بتا دیا کہ حکام بالاک کی خصوصی اجازت سے ایک تفتیشی افسر کو ایک آخری کوشش کے طور پر آج شام اس قصبے میں پہنچنا تھا، لیکن شاید خراب موسم کی وجہ سے اسے کچھ دیر ہو گئی ہے۔ پولیس کے اعلیٰ تفتیشی حکام اب بھی ایک آخری امید رکھے ہوئے تھے کہ شاید اپنی موت سے ایک رات پہلے سکندر کا دل پکھل جائے اور وہ جاتے جاتے کچھ ایسا بتا دے جو ان کی تفتیش میں کارآمد ثابت ہو سکے اور سکندر کے اصل گروہ کی گرفتاری میں ان کی مدد کر سکے۔ دوسری جانب چونکہ یہ قتل قصاص و دیت کی مد میں درج کیا گیا تھا، لہذا مقتول کی بیوہ کو اس کے پہلے وارث کے طور پر پھانسی دیکھنے کے لیے جیل بلایا گیا تھا۔ قصاص و دیت کے قتل کے کیسز میں مقتول کے سب سے قریبی ورثاء میں سے کسی کو قاتل کی پھانسی کا نظارہ دیکھنے کے لیے جیل مدعو کیا جاتا تھا اور قاتل کو مقتول کے وارث کے سامنے ہی پھانسی پر لٹکایا جاتا تھا۔ وارث کو پھانسی سے آخری لمحے قتل تک قاتل کی سانسیں بخش دینے کا اختیار بھی ہوتا تھا، چاہے وہ سانسیں قصاص کی رقم کے عوض ہی کیوں نہ بخشے۔ لیکن اس سکندر نامی قاتل کی پھانسی دیکھنے کے لیے مقتول رؤف نامی شخص کی بیوہ نائلہ، اپنے پانچ سالہ بیٹے کے ساتھ ہزاروں میل کا سفر طے کر کے بیرون ملک سے اس پس ماندہ قصبے تک پہنچی تھی، کیوں کہ اس کے شوہر کے قتل کے بعد حفاظت کے نقطہ نظر سے اس کے والدین نے اسے ملک سے باہر بھجوا دیا تھا۔ اقبال کے بقول، اس کا خیال یہ تھا کہ اتنی دور سے مقتول کی بیوہ، اپنے شوہر کے قاتل کی پھانسی دیکھنے کے لیے نہیں پہنچ پائے گی، لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی، جب آج شام ہی بارش سے کچھ قبل نائلہ، اپنے اکلوتے بیٹے سمیت اس قصبے کے اسٹیشن پر صرف ایک سوٹ کیس کے ساتھ کھڑی جیل کی گاڑی کا انتظار کرتی ہوئی انہیں ملی۔ جیلر کے ایک سوال کے جواب میں کہ نائلہ نے ہزاروں میل کا سفر کس لیے طے کیا، کیوں کہ پھانسی تو اس کی غیر موجودگی میں بھی طے پا جاتی، نائلہ نے صرف اتنا ہی کہا کہ وہ اس پھانسی کا صدیوں سے انتظار کر رہی ہے اور اسے تب تک سکون کی نیند نہیں آئے گی، جب تک وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے شوہر کے قاتل کو پھانسی کے پھندے پر جھولتے ہوئے نہیں دیکھ لے گی۔ بقول اقبال، اس نے آج تک اتنے آہنی اعصاب والی لڑکی نہیں دیکھی تھی، کیوں کہ ابھی تک مقتول کی بیوہ کم عمری تھی۔ نہ جانے، اس بے چاری نے اس نو جوانی ہی میں یہ بیویگی کا وارغ کیسے جھیلنا ہوگا؟ کچھ ہی دیر میں حوالدار نے آ کر خبر دی کہ ”بڑے شہر“ سے افسر آ گیا ہے، لیکن اس نے آتے ہی جیل میں قیدی سے ملاقات کی

خواہش ظاہر کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے پاس وقت بہت کم ہے، لہذا وہ مزید ایک لمحہ ضائع کے بغیر قیدی سے مل کر اپنی تفتیش کا آغاز کرنا چاہتا ہے۔ جیلر یہ سنتے ہی جلدی سے کھڑا ہو گیا ”ٹھیک ہے..... ہم یہاں سے سیدھے جیل ہی جائیں گے اور ہاں..... اس جلا دکان کیا بنا..... وہ پہنچا کہ نہیں؟“ حوالدار نے اپنی ٹوپی سیدھی کی۔ ”نہیں جناب..... جلا دکانی الحال کچھ اتنا پتا نہیں ہے۔ جیل کے دو سپاہی کشتی سمیت ٹوٹے ہوئے پل کے قریب پوری رات جلا دکان انتظار کریں گے..... تاکہ رات کو کسی بھی پہراگر وہ قصبے تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے تو ہمارا عملہ اسے لے کر سیدھا جیل پہنچا دے.....“ ”ہوں“ جیلر نے لمبا سا ہنگارا بھرا اور سلطان بابا سے واپسی کے لیے اجازت چاہی۔ پتا نہیں، اس لمحے اچانک ہی میرے ذہن میں ایک عجیب سے سوال نے کہاں سے سر اُبھارا اور میں اپنی خواہش کو زبان پر آنے سے روک نہیں پایا۔ ”جیلر صاحب..... کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کے اس قیدی کو میں آج رات ہی دیکھ پاؤں..... کل تو اس کی سانسوں کی معیاد بالکل ہی مختصر ہوگی..... جانے اس وقت وہ اپنے حواس میں بھی ہوگا، یا نہیں.....؟“ میرا فرمائش نما سوال سن کر اقبال شش و پنج میں پڑ گیا۔ ”مجھے تو کوئی اعتراض نہیں، لیکن جانے وہ تفتیشی افسر اس بات پر راضی ہو، یا نہیں..... کیوں کہ بہر حال سکندر ایک خطرناک قیدی ہے، جس کی آخری لمحے تک کڑی نگرانی کے احکامات ہمیں بہت پہلے موصول ہو چکے ہیں۔“ میں نے اقبال کی طرف دیکھا ”لیکن جیل میں اس قیدی کا ہر انتظام آپ کے ذمے ہے۔ اس سے کسے ملنے کی اجازت ہو سکتی ہے اور کسے نہیں، اس کا فیصلہ شاید صرف آپ ہی کر سکتے ہیں، یا پھر وہ قیدی خود..... آپ پر اعلیٰ حکام کا دباؤ تو ضرور ہوگا، لیکن فرض کریں کہ کسی بھی وجہ سے اگر آپ اس تفتیشی افسر کو بھی اس قیدی سے ملاقات کی اجازت دینے سے انکار کر دیں تو کوئی لاکھ سوچنے، لیکن قیدی کی کوٹھڑی تک نہیں پہنچ سکتا، لہذا آپ کا اختیار تو اپنی جگہ قائم ہے۔“ جیلر کچھ دیر تک میری جانب غور سے دیکھتا رہا، پھر جانے کیا سوچ کر اس نے ہتھیرا ڈال دیئے۔ ”ٹھیک ہے میں کوشش کرتا ہوں..... آپ بھی میرے ساتھ ہی چلئے.....“ میں نے سلطان بابا کی جانب اجازت آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ وہ اپنی تسبیح پر دل رہے تھے۔ ”جاؤ میاں..... تم بھی اس بد نصیب کو دیکھ آؤ..... لیکن یاد رہے، جب جب جو جو ہوتا ہے..... تب تب سو سوتا ہے.....“ میں نے چونک کر سلطان بابا کی آنکھوں میں کوئی تحریر پڑھنے کی کوشش کی، لیکن وہ اپنی آنکھیں بند کر کے پھر سے تسبیح پڑھنے میں مصروف ہو چکے تھے۔

میں جیلر اقبال اور اس کے حوالدار کے ساتھ بارش میں بھٹکتا ہوا مسجد کے باہر کھڑی جیپ کی جانب بڑھ گیا۔ جیپ کا ڈرائیور جو بارش کی خنکی سے بچنے کے لیے اپنی بیڑی سگائے سگڑا سمنا سا جیپ میں بیٹھا تھا، ہمیں دیکھ کر فوراً چاقو و چو بند ہو گیا اور ہمارے بیٹھے ہی ایک جھٹکے سے جیپ آگے بڑھادی۔ قصبے کی واحد مرکزی سڑک اور اس پاس کی گلیاں سب جل تھل تھیں۔ کچھ بھٹکے اور سردی سے کپکپاتے آوارہ کتوں نے جیپ کی آواز سن کر چونک کر سر اٹھایا اور پھر بھونک کر پیچھا کرنے کی سکت نہ پا کر صرف غرا کر ہی چپ ہو گئے۔ کچھ ہی دیر بعد جیپ نے قصبے کی آخری گلی کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ گھپ اندھیرے میں دو درختیں لپکتی نیلی بجلی کے جھماکے میں مجھے ایک بہت بڑی قلعہ نما عمارت کی جھلک کسی نیلی روشنی میں نہائے ہوئے کی طرح دکھائی دی۔ ٹھیک اسی لمحے میرے ذہن میں بھی ایک جھماکا ہوا اور مجھے پھر وہی پرانا احساس بری طرح ڈسنے لگا کہ میں نے پہلے بھی کبھی کہیں نہ کہیں یہ عمارت دیکھی ہے۔ میرے سر میں شدید درد کی ایک لہری اٹھی اور پھر چند لمحوں ہی میں حسب معمول سب کچھ پہلے کی طرح معمول پر آ گیا۔ جیپ جیل کی عمارت کے سامنے جا کر رک گئی۔ پرانے قلعے کی طرز کی وہ جیل اس وقت اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ شاید بجلی کا رابطہ منقطع تھا۔

برجیوں پر کھڑے محافظوں نے برق رفتاری سے اپنی بڑی بڑی مشعل نما ٹارچیں روشن کر کے پہلے اوپر ہی سے اپنا اطمینان کیا اور پھر جلدی سے اندرونی دروازے کی دوسری جانب کسی کو بڑے جیلر کی آمد کی اطلاع دی۔ اندرونی سنتری نے اپنے اطمینان کے لیے جیل کے مرکزی دروازی میں بنی لوہے کی چھوٹی سی دراز نما کھڑکی سے ایک بار ہمارا جائزہ لیا اور پھر چھوٹا دروازہ کھول دیا۔

جیلر کا کمرہ مرکزی گیٹ کے ساتھ ہی واقع تھا جس کے بعد ایک اور بڑا سا آہنی گیٹ تھا، جس کے بعد جیل کی اصل عمارت شروع ہوتی تھی۔ لیکن اقبال نے اپنے حوالدار کو مجھے اسی برآمدے میں واقع ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں بٹھانے کا کہا اور خود اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ شاید وہ تفتیشی افسر سے پہلے ملاقات کر کے اسے میرے بارے میں بتانا چاہتا ہو۔ کچھ ہی دیر بعد حوالدار نے آ کر مجھے بتایا کہ سکندر نامی قیدی کو تفتیش کے لیے بنے خصوصی کمرے میں پہنچا دیا گیا ہے اور بڑے جیلر صاحب میرا وہیں انتظار کر رہے ہیں۔ میں حوالدار کی سربراہی میں جیل کا اندرونی بڑا گیٹ پار کر کے جیل کی اندرونی دنیا میں داخل ہو گیا، جہاں سب سے پہلے نہایت احتیاط سے تین مرتبہ میری تلاشی لی گئی اور پھر ہم جیل کی راہ داریوں سے ہوتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ جیل کی تمام عمارت ایک عجیب سے یا سیت زدہ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ لگتا تھا جیسے پوری عمارت پر کسی بھیانک آسیب کا سایہ ہو۔ دن بھر کے تھکے ہارے قیدی اپنی کوٹھڑیوں اور بیرکوں میں ایک دوسرے سے الگھے، پڑے سو رہے تھے۔ البتہ پھانسی گھاٹ کی جانب بنی کال کوٹھڑیوں سے زور زور سے قرآن اور تسبیح پر ”اللہ ہو“ کی آوازیں سنائے کو چیرتی ہوئی آرہی تھیں۔ مجھے ایک بار پھر سے موت اور مذہب کے اس عجیب سے تعلق نے الجھا سادیا۔ آخر صرف موت، یا موت کا تصور ہی ہمیں مذہب کے قریب ہونے پر کیوں مجبور کرتا ہے؟ کیا صرف موت کے بعد ملنے والی سزا کا خوف ہی ہمیں مذہب کو اپنانے پر مجبور کرتا ہے؟ ہم خوشی میں اور اپنی مرضی سے کسی سزا کے خوف، یا کسی جزا کی لالچ کے بنا مذہب کو کیوں نہیں اپنا سکتے.....؟ کیا ہمیں دنیا میں صرف اس خوف کا سامنا کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا، جو انسانی موت اور اس کے بعد ملنے والی سزاؤں سے متعلق تھا؟ ہمیں اپنی خوشی سے بندگی کا اختیار کیوں نہیں دیا گیا۔

میں اسی سوچ میں مبتلا تھا کہ اچانک حوالدار نے ایک راہ داری کے آخر میں بنی ہوئی لوہے کی سڑھیوں کے قریب رک کر مجھے اوپر چڑھنے کا اشارہ کیا اور خود نیچے برآمدے ہی میں کانڈھے سے اپنی بندوق اتار کر مستعدی سے پہرہ دینے کے لیے ٹھہر گیا۔ میں لوہے کی بنی ہوئی سیڑھی چڑھ کر جب اوپر پہنچا تو خود کو ایک گول کمرے میں پایا۔ سڑھیاں بہت اونچی تھیں اور میرے اندازے کے مطابق مجھے اس وقت تیسری منزل کے برابر اونچائی پر ہونا چاہئے تھا۔ یہ گول کمرہ دراصل نیچے سے آتی ہوئی دیوار ہی کا تسلسل تھا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ میں ایک بہت بڑے تنور کے دہانے پر موجود تھا۔ جیلر اقبال بھی اوپر موجود تھا اور نیچے کی منزل میں، جہاں اس تنور کا پینڈا تھا، وہاں نچلے گول کمرے میں ایک شخص کمرے میں پڑی دو کرسیوں میں سے ایک پر یوں بیٹھا ہوا تھا کہ اس کے ہاتھ کرسی کے پیچھے موٹی رسی کے ذریعے بندھے ہوئے تھے۔ یہی فوجوان ”سکندر“ نامی وہ قیدی تھا جس کا ذکر میں شام سے سن رہا تھا۔ کمرے کی دیواریں بالکل چکنی تھیں، اتنی کہ کوئی لاکھ کوشش بھی کرتا، پر اس کا ان دیواروں سے چپک کر اوپر چڑھنا ناممکن تھا اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ وہ گول کمرہ، جیسے جیسے بلند ہوتا جاتا تھا، ویسے ہی چاروں طرف سے مزید تنگ ہوتے ہوتے چھت تک صرف ایک گول دہانہ سا رہ جاتا تھا۔ شاید یہ سارا انتظام قیدیوں کے ذہن میں اٹھنے والے فرار کے کسی بھی خیال کو پوری طرح کچلنے کے لیے کیا گیا تھا۔ میں جیلر اقبال

کے ساتھ ہی پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ویسے بھی اوپر کی گولائی میں بمشکل دو کرسیاں رکھنے کی ہی گنجائش تھی۔ کچھ ہی دیر میں پینٹ اور کوٹ میں ملبوس ایک ۴۰، ۴۵ سالہ شخص اندر داخل ہوا۔ جیلر نے آہستہ سے مجھے بتایا۔ ”یہ راجیل صاحب ہیں۔ تفتیشی افسر۔۔۔۔۔ ایس ایس پی راجیل۔۔۔۔۔“ اس وقت نیچے گول کمرے میں بہت سی موم بتیاں روشن تھیں، جن کے ملگجے جالے میں، میں نے راجیل صاحب کو بغور دیکھا۔ چہرے پر نظر کا سنہرا فریم، ہونٹوں میں سگار، بال سلیقے سے بنے ہوئے، مجھے وہ روایتی پولیس والوں سے کافی مختلف دکھائی دیئے اتنے میں اچانک جیل کی بجلی واپس آ گئی اور نیچے گول کمرہ روشن ہو گیا، جب کہ اوپر والے حصے کی بتیاں شاید جیلر نے پہلی ہی بجھا رکھی تھیں، اس لیے ہم دونوں مزید اندھیرے میں چلے گئے۔ اوپر سے لوہے کی جالیوں میں سے نیچے گول کمرے میں جھانکتے ہوئے مجھے بالکل یوں محسوس ہوا جیسے ہم کسی اندھیرے سینما ہال میں بیٹھے روشن اسکرین پر کوئی فلم دیکھ رہے ہوں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ سینما کی اسکرین سامنے ہوتی ہے اور یہاں اسکرین دیکھنے کے لیے ہمیں نیچے کی جانب جھانکنا پڑ رہا تھا اور ہمارے درمیان لوہے کی وہ موٹی سی جالی نما کھڑکی بھی حائل تھی جس نے اس تنور کے دہانے کو ڈھک رکھا تھا۔ تفتیشی کمرے میں روشنی کے لیے ہزار وولٹ کا بجلی کا صرف ایک بلب کمرے کے وسط میں کچھ ایسے زاویے سے لٹا کا یا گیا تھا کہ اس کی براہ راست روشنی صرف قیدی کے چہرے ہی پر پڑ رہی تھی۔ اچانک روشنی سے قیدی کی آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ پھر اس نے دھیرے دھیرے اپنی پیٹی ہوئی آنکھیں کھولیں اور راجیل صاحب کی طرف دیکھ کر ہلکے سے مسکرایا ”چلیں شکر ہے، آپ کے آنے سے کچھ لمحوں کے لیے ہی سہی۔۔۔۔۔ لیکن اُن کچھ چراغوں میں روشنی تو آئی۔۔۔۔۔ ورنہ میں تو شاید اس ملک کو روشن دیکھنے کی حسرت ہی میں جان وے دیتا۔۔۔۔۔ ویسے سنا ہے کہ ۲۰۰۹ تک ملک سے لوڈ شیڈنگ ختم ہو جائے گی۔۔۔۔۔ آپ کو مبارک ہو راجیل صاحب۔“ راجیل صاحب سمیت میں اور جیلر بھی سکندر کا یہ جملہ سن کر چونک گئے۔ راجیل صاحب نے سگار کا لمبا سا کش لیا۔ ”گزشتہ چندرہ مہینوں سے جیل میں بند ہونے کے باوجود تمہاری معلومات کا ذخیرہ قابل ستائش ہے۔۔۔۔۔“ سکندر نے طنز سے راجیل کی جانب دیکھا۔ ”جیل میں بند ہونے کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ انسان اپنی آنکھیں بھی بند کر لے۔ ویسے آپ کا بھی قصور نہیں ہے، پولیس والوں کو عام طور پر آنکھیں بند کر لینے کی عادت ہوتی ہے۔“ راجیل صاحب کرسی پر بیٹھ گئے۔ ”بہت تعجبی ہے تمہارے لہجے میں۔۔۔۔۔ لیکن یاد رکھو، سب پولیس والے ایک جیسے نہیں ہوتے۔“ سکندر کے لبوں پر پھر سے مسکراہٹ آ گئی۔ ”ٹھیک کہا آپ نے۔۔۔۔۔ واقعی سب ایک سے نہیں ہوتے۔۔۔۔۔ جو بھی ملا، پچھلے سے کچھ بدتر ہی نکلا۔ ویسے ہمیں تو آنکھیں کھلی رکھنی ہی پڑتی ہیں راجیل صاحب۔۔۔۔۔ ہم آپ جیسے بڑے افسر تو ہیں نہیں، کہ جنہیں ہر ماہ کے آخر میں گھر بیٹھے کچھ نہ کرنے کی بھی تنخواہ مل جائے۔۔۔۔۔ جنہیں اپنے حقوق کی جنگ لڑنی ہوتی ہے، انہیں آنکھیں اور کان کھلے رکھنے پڑتے ہیں۔“ راجیل صاحب نے سگار منہ سے نکالا۔ ”کن حقوق کی جنگ کی بات کر رہے ہو تم؟ سچ تو یہ ہے کہ چند ملک دشمن عناصر کے ہاتھ میں کھیل رہے ہو تم لوگ۔۔۔۔۔ جانے یہ کیسا برین واش ہے کہ خود اپنی موت کو گلے لگانے کو ترستے ہو۔۔۔۔۔ یہ جانے بغیر کہ تمہاری اس قربانی کی کوئی وقعت نہیں ہے، تمہارے آقاؤں کی نظر میں۔۔۔۔۔“ سکندر نے لمبی سی جہائی لی۔ ”اچھا بول لیتے ہیں آپ۔ ضرور کالج اور یونیورسٹی میں تقریری مقابلوں میں اول آتے رہے ہوں گے۔۔۔۔۔“ راجیل صاحب نے سکندر کی آنکھوں میں جھانک کر جواب دیا۔ ”اسکول اور کالج میں تو تم بھی انتہائی غیر معمولی طالب علم رہے ہو۔۔۔۔۔ میٹرک میں ٹاپ کرنے پر تمہیں صدارتی وظیفہ بھی دیا گیا تھا۔۔۔۔۔ کیا تم نے اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ بڑے ہو کر ایک دہشت گرد بنو گے۔۔۔۔۔؟“

جانے اس ”دہشت گرد“ لفظ میں ایسا کیا تھا کہ سکندر تڑپ کر رہ گیا۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور سی سے بندھے ہاتھ کمر کے پیچھے بل کھا کر رہ گئے۔ اس نے تقریباً غراتے ہوئے کہا۔ ”اپنے اپنے نظریے کی بات ہے جناب..... آپ کی نظر میں میں ایک دہشت گرد ہوں، جب کہ میری نظر میں آپ کا محکمہ راشی اور بے ایمان لوگوں کا گڑھ ہے..... مجھے قدرت نے زیادہ موقع نہیں دیا، ورنہ آپ کے محکمے کی اچھی خاصی صفائی کر جاتا.....“ اس بار راجیل صاحب تلملٹا کر پلٹے۔ ”چند غلط لوگوں کا الزام سارے محکمے کے سر دھرنا سراسر بے وقوفی ہے..... اور پھر ٹھیک اور صحیح کا فیصلہ کرنے والے تم کون ہوتے ہو..... اس کے لیے پورا نظام موجود ہے۔“ سکندر نے نفرت سے ہونٹ سکڑے ”ہونہہ..... کیا آپ کا محکمہ اور کیا اس کا نظام..... مت بھولنے کہ اس وقت، جو آپ یہاں کھڑے میرا وقت برباد کر رہے ہیں، اس کی اجازت بھی آپ کو صرف اسی ”دہشت گرد“ کی مرضی سے ملی ہے..... ورنہ مجھے آپ ہی کے قانون نے یہ اجازت دی ہے کہ میں اپنا یہ آخری وقت جیسے بھی چاہوں، صرف کر سکتا ہوں..... میں نے سوچا کہ کوٹھڑی میں پڑے پڑے بور ہوتا رہوں گا..... چلو، کچھ تفریح ہی سہی..... ورنہ میں نہ چاہوں تو آپ مزید ایک لمحہ بھی یہاں نہیں ٹھہر سکتے..... تو ایک دہشت گرد کی آخری دین سمجھ کر اس قیمتی وقت کی قدر کیجئے..... مجھے آپ کے لیکچرز سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔“

میں اور اقبال جیلر دم سادھے سکندر اور راجیل صاحب کی لفظوں کی یہ جنگ سن رہے تھے۔ راجیل صاحب اپنی کرسی سے اٹھ کر سکندر کے قریب آ گئے اور پھر اس کی کرسی پر جھک کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے ”ٹھیک کہا تم نے..... مجھے مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے..... تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تمہاری تنظیم نے تمہاری پھانسی کے وقت ملک کے کس شہر میں اور کتنے بم دھماکے کرنے کا منصوبہ تیار کر رکھا ہے.....؟“



ڈاٹ کام

آخری سجدہ

رائیل کا سوال سن کر سکندر نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ”اوہ تو آخر کار دل کی بات زبان پر آ ہی گئی۔ یہ آپ جیسے ایس پی افسر، جو چند کتابوں کا رٹا لگا کر مقابلے کا امتحان پاس کر لیتے ہیں، وہ آخر اپنے آپ کو عقل کل کیوں سمجھنے لگتے ہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ آپ میری موت سے ایک رات پہلے سگار کے کش لیتے ہوئے آئیں گے اور مجھ سے وہ سب جان لیں گے جس کی کھوج میں آپ کا پورا منکھ جانے کتنے برسوں سے سرگرداں ہے۔ کاش آپ لوگوں کو سی ایس پی کے بعد عام فہم کی بھی کچھ ٹریننگ دے دی جاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔“ رائیل صاحب نے بہت سکون سے سکندر کی ساری طعنہ زنی برداشت کی۔ ”تو گویا تمہیں ملک میں لیے جانے والے مقابلے کے امتحان کے طریقہ کار سے متعلق بھی کچھ اعتراضات ہیں۔ جہاں تک میں نے تمہارا ریکارڈ دیکھا ہے مجھے یاد پڑتا ہے کہ خود تم نے بھی بی اے کے بعد سی ایس ایس کے لیے اپلائی کیا تھا، کہیں تمہاری اس تلقینی کی وجہ تمہاری اپنی ناکامی تو نہیں۔“ سکندر زور سے چلا یا۔ ”نہیں، میں ناکام نہیں ہوا تھا۔ تحریری امتحان میں میرے بہت اچھے نمبر تھے لیکن زبانی امتحان لینے والوں کو شاید میری صورت پسند نہیں آئی، یا پھر ان میں سے کوئی ایک صبح اپنی بیوی سے لڑ کر دایا لینے آیا تھا۔ تب ہی انہوں نے مجھ سے کچھ ایسے غیر متعلق اور اوٹ پناہنگ سوال پوچھے جن کا نہ سر تھا نہ پیرو، یا پھر شاید جس ایک سیٹ پر مجھ میں اور ایک وزیر کے بیٹے میں مقابلہ تھا، اسے مجھ سے چھیننے کے لیے انہیں مجھ سے افریقہ کے جنگلوں میں پائے جانے والے ایک خاص جھینگے کی نسل بتانے جیسے سوالات ہی کرنے چاہئے تھے، جن کا میرے تحریری امتحان کے مضامین سے قطعاً کوئی تعلق نہ تھا۔ باقی ڈیڑھ سو کے قریب امیدواروں میں سے بھی کسی کو اس سوال کا جواب معلوم نہیں تھا، لیکن صرف اس وزیر کے بیٹے کو نہ صرف جھینگے کی نسل معلوم تھی بلکہ اس نے تو جھینگے کا شجرہ نسب بھی فر فر بیان کر دیا۔ نتیجتاً وہ اگلے مینیسٹ اسٹنٹ کمشنر تعینات ہو گیا اور میرا نام کامیاب امیدواروں کی فہرست سے خارج۔“ رائیل صاحب نے پھر سے سگار کا لمبا ساش لیا۔ ”ہو سکتا ہے تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہو، لیکن تم نے دوبارہ کوشش بھی تو نہیں کی۔ یقین کرو، میں خود ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں اور میں بھی اسی نظام کے تحت لیے جانے والے امتحان کے ذریعے پاس ہو کر پولیس میں بھرتی ہوا تھا، تمہاری شکایت اپنی جگہ۔“ سکندر نے ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی۔ ”میری شکایت اب بھی اپنی جگہ ہے۔ آپ خود ہی بتائیں کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ برسوں محنت کرنے والے اور پروفیشنل کالجوں سے برسوں کی پڑھائی کے بعد نکلنے والے ڈاکٹر اور انجینئر تو اس معاشرے میں معمولی کلرکوں کا درجہ پاتے ہیں، جب کہ ایک سادہ بی اے پاس لڑکا چند مہینوں میں دو چار کتابیں رٹ کر اعلیٰ افسر بن جاتا ہے اور اپنے رٹے کے بل پر کامیاب ہو کر قوم کی قسمت کے فیصلے کرنے لگتا ہے۔ کبھی ان افسر بن جانے والوں سے بعد میں کسی نے ان مضامین کے بارے میں پوچھنے کی زحمت بھی کی؟ لیکن اگر کوئی پوچھے تو اسے پتا چلے گا کہ ایک لفظ بھی یاد نہیں ہوتا ان ”افسران بالا“ کو۔ پھر یہ مقابلے کا امتحان صرف یادداشت اور رٹے کا مقابلہ ہی تو ہونا، اور ہم غریبوں کا حافظہ تو پہلے ہی قانون اور پریشانیوں کی وجہ

سے کمزور اور خراب ہو چکا ہوتا ہے۔ سو غریب کا بچہ کلرک پیدا ہوتا ہے اور کلرک ہی مر جاتا ہے۔“ ”ٹھیک ہے، مقابلے کے امتحان کے طریقہ کار میں کچھ خامیاں ہو سکتی ہیں اور ان خامیوں کو دور کرنے کے لیے بذریعہ قلم جدوجہد بھی کی جاسکتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہماری نوجوان نسل بندوق اٹھا کر سڑکوں پر آ جائے۔“ ”معصوم اور بے گناہ لوگوں کے خون سے ہاتھ رنگنے لگے۔“ سکندر نے زور سے سر جھٹکا ”ہونہہ، معصوم اور بے گناہ لوگ..... غلط فہمی ہے آپ کی، میری تنظیم نے آج تک صرف کرپٹ، راشی اور بے ایمان لوگوں کے خلاف ہی ایکشن لیا ہے۔ ہم صرف اس غلیظ معاشرے کی صفائی کر رہے ہیں اور کچھ نہیں۔ اور میرا ضمیر آج پھانسی سے ایک رات قبل بھی بالکل مطمئن ہے کہ میں نے اپنا فرض نبھایا ہے اور بس.....“ ”راہیل صاحب نے تاسف سے ہاتھ ملے۔“ ”کاش میں اس آخری وقت ہی میں تمہاری آنکھوں پر پڑا یہ پردہ اٹھا پاتا۔ بہر حال میں تمہیں آج رات کا وقت مزید دے رہا ہوں۔ ایک بار پھر سوچ لو، کل کی رات تمہاری زندگی کی آخری رات ہوگی۔ جانے سے پہلے کفارہ ادا کر جاؤ گے تو بہت سوں کا بھلا ہو جائے گا اور شاید تمہاری بخشش بھی۔“ ”راہیل صاحب واپسی کے لیے پلٹے، سکندر نے ان کے جاتے جاتے فقرہ کسا۔“ ”اگر آپ کی نظر میں، میں اتنا بڑا گناہ گار ہوں تو پھر یہ بھی جان لیجئے کہ ساری عمر کے گناہ کے داغوں کو یہ ایک آخری سجدہ بھی بھلا کیا دھو پائے گا۔ کم از کم ایسے مشورے دے کر میرے گناہ تو بے لذت نہ کیجئے۔ آپ جس میڈل کی تلاش میں مجھ تک پہنچے ہیں، کم از کم میں اپنے کاندھوں پر چڑھ کر آپ کو اس تحفے تک نہیں پہنچنے دوں گا۔“ اتنے میں دو سنتری اندر آ گئے۔ راہیل صاحب گول کمرے سے باہر نکل چکے تھے۔ سنتریوں نے سکندر کو کرسی سے کھولنے سے پہلے بیڑیوں اور جھکڑیوں میں جکڑ لیا۔ اقبال جیلر اور میں جب گول کمرے کی چھت سے سڑھیاں اتر کر نیچے آئے، تب تک فجر کی اذانیں شروع ہو چکی تھیں۔ نماز کے بعد سلطان بابا چہل قدمی کے لیے باہر نکل گئے اور میں اپنی جلتی آنکھیں لے، کچھ دیر کے لیے کمر ٹکانے کے لیے لیٹ گیا۔ لیکن بند آنکھوں تلے بھی میں سکندر ہی کا چہرہ دکھتا رہا اور میرے کانوں میں اس کے سلگتے جملے گونجتے رہے۔

ابھی سورج چڑھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ سنتری نے آ کر مجھے جگا دیا کہ سلطان بابا ناشتے پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے بمشکل چند گھنٹ چائے طاق سے نیچے اتاری۔ نہ جانے ایک عجیب سی بے چینی کیوں میری رگ و پا میں سرایت کرتی جا رہی تھی، جیسے کچھ انہونی ہونے والی ہو۔ ناشتے کے فوراً بعد سلطان بابا اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”چلو عبداللہ میاں۔ ذرا نیچی سے مل آئیں۔“ پہلے تو مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا، لیکن اسی لمحے جیلر اقبال کی گاڑی اس احاطے کے باہر آ کر رکی، جس میں مجھے اور سلطان بابا کو ٹھہرایا گیا تھا۔ جیلر کچھ غلت میں دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ”میں نے بیوہ سے بات کر لی ہے۔ اگر آپ لوگ تیار ہیں تو ہم ابھی ریٹ ہاؤس کے لیے نکل سکتے ہیں۔“ تب مجھے سمجھ میں آیا کہ سلطان بابا کی مراد مقتول کی بیوہ سے تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم ریٹ ہاؤس کے برآمدے میں بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ صبح نماز کے وقت بارش کچھ ختم سی گئی تھی، لیکن اس وقت پھر سے ہلکی ہلکی بوند باندی شروع ہو چکی تھی۔ ریٹ ہاؤس کے اینٹوں والے کچے صحن میں پانی کا ایک بہت بڑا سا جو ہڑ بن گیا تھا اور اس وقت برستی بوندوں کا ارتعاش اس ٹھہرے پانی میں کچھ ویسی ہی ہل چل پیدا کر رہا تھا، جیسے اس وقت میرے دل و دماغ میں مچی ہوئی تھی۔ جیلر ہمیں یہاں کیوں لے کر آیا تھا؟ ہمیں مقتول کی بیوہ سے ملوانے کا کیا مقصد تھا؟ میرا ذہن انہی سوالوں میں الجھا ہوا تھا کہ اتنے میں اندر کمرے کی جانب سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں آنے والی کے احترام میں کھڑا ہو گیا۔ وہ کالے لباس میں ملبوس چپ چاپ سلام کر کے ہمارے

سانے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ سیاہ لباس میں اس کا سوگوار حسن کچھ اور نکھر گیا تھا۔ اس وقت وہ خود بھی آسمان پر چھائی گھٹا ہی کی طرح لگ رہی تھی، کچھ برسی سی برکھا جیسے۔ کچھ دیر تک ماحول پر عجیب سی گھمبیر خاموشی طاری رہی، پھر اسی نازنین نے اپنے لب کھولے ”سپرٹنڈنٹ بتا رہے تھے کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔“ سلطان بابا نے اسے دعا دی ”جی ہاں رہو بیٹی۔ ہاں میرا ہی نام سلطان ہے اور میں نے ہی تم سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ تم ایک بہادر لڑکی ہو اور بہادروں کا ظرف بھی بڑا ہوتا ہے اور اسی ظرف کی امید پر میں یہاں تک چل کر آیا ہوں۔“ اس نے چونک کر سر اٹھایا اور دھیرے سے بولی۔ ”آپ فرمائیے، میں سن رہی ہوں۔“ بابا نے اپنی بات کا سلسلہ جوڑا۔ ”مجھے جیلر صاحب نے بتایا ہے کہ تم قاتل کی پھانسی دیکھنے کے لیے ہزاروں میل دور سے یہاں تک کا سفر طے کر کے آئی ہو لیکن اپنے دل کو ٹٹول کر پوچھو، کیا کل صبح صادق سے پہلے جب یہ پھانسی سرانجام پا چکی ہوگی تو کیا تمہارا سفر ختم ہو جائے گا؟“ اس نے حیرت سے سلطان بابا کو دیکھا ”میں سمجھی نہیں، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔“ ”میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ دو سال سے تم نے اپنے اس درد، اپنے اس رنج و الم کے سفر کی منزل اس ”پھانسی“ کو بتا رکھا تھا۔ کل یہ منزل بھی سر ہو جائے گی پھر اس کے بعد کیا یہ درد، یہ کرب ختم ہو جائے گا۔ کہیں پہلے سے بھی سوا ہو گیا تو؟“ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ شاید کل کے بعد میرے درد کا اصل سفر شروع ہوگا۔ میرے دل کی واحد خواہش، واحد تسلی بھی ختم ہو جائے گی۔ رؤف کا قاتل بھی اپنے انجام کو پہنچ جائے گا لیکن میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ مجھے تمام عراب اسی کرب، اسی درد کے ساتھ گزارنی ہے۔ یہی میرا مقدر ہے۔“ ”نہیں بیٹی، تمہارا مقدر ایک ازلی سکون بھی ہو سکتا ہے۔ اگر تم اس وقتی بدلے کی خواہش کو اپنے دل سے نکال کر اس قاتل کو معاف کر دو۔“ مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا اور نالہ نہ ٹپ کر غصے میں اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ ”کیا..... کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں اپنے معصوم شوہر اور اپنے بچے کے باپ کے سفاک قاتل کو معاف کر دوں۔ کیا آپ بھی اسی کے کوئی ساتھی ہیں جو مجھے بدل کر ایک بار پھر مجھے لوٹنے کے لیے آئے ہیں۔ مجھے آپ سے مزید کوئی بات نہیں کرنی ہے۔“ نالہ نے تیزی سے پلٹ کر واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے۔ خود مجھے بھی سلطان بابا سے ایسی کسی بات کی توقع نہیں تھی، لیکن ان کے لہجے میں اب بھی وہی پرانا غمراہ تھا۔ ”میں بھی کسی ظرف کے بھرم ہی میں تم تک پہنچا ہوں بیٹی، درگزر سب سے بڑا انتقام ہے۔“ وہ چلتے چلتے رک گئی اور پلٹ کر خیمکی نظروں سے ہمیں دیکھا۔ ”میری جگہ اگر آپ کی بیٹی کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا ہوتا تو کیا آپ اسے بھی یہی مشورہ دیتے؟“ سلطان بابا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور چار قدم بڑھا کر نالہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”میں اپنے خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ آج اگر اس وقت تمہاری جگہ میری اپنی لگی بیٹی بھی کھڑی ہوتی تو میں اس سے بھی یہی التجا کرتا، کیوں کہ تمہارا مجرم راہ سے بھٹکا ہوا ایک ایسا شخص ہے جو اپنی دانست میں کچھ غلط نہیں کر بیٹھا۔ وہ تم پر کئے گئے ظلم کو کبھی کسی کے حق کی داد ہی سمجھتا ہے، ہو سکتا ہے تمہاری معافی اسے راہ راست پر لے آئے۔“ نالہ نے بہت ضبط کی کوشش کی لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک ہی پڑے۔ ”تو گویا آپ بھی اس مکار شخص کی باتوں میں آ گئے۔ وہ آج تک پولیس اور باقی زمانے کو تو یہ جھانسا دیتا ہی رہا ہے کہ اس کا ہر جرم ایک مقصد کو پانے اور کسی اور کو اس کے گناہوں کی سزا دینے کی کوشش میں سرزد ہوا اور شاید میں بھی اس فلسفے سے متاثر ہو کر اسے بخشش دینے کا فیصلہ کر ہی لیتی، اگر اس کی اصلیت نہ جانتی۔ آپ بھی جس لمحے اس شخص کے اصل مکروہ چہرے کو قریب سے دیکھیں گے تو مجھ سے پہلے خود چلا انھیں گے کہ اس کا مقدر صرف اور صرف پھانسی کا چھندا ہی ہونا چاہئے۔“ نالہ اب باقاعدہ ہلک ہلک کر رو رہی تھی، جب کہ

ہم تینوں ابھی تک اسی حیرت اور شش و پنج کی سی کیفیت میں کھڑے تھے کہ آخر اس نازک سی لڑکی کو ایسا کون سا راز پتا ہے، جس نے اس کے اندر انتقام اور نفرت کا ایک ایسا لاوا دھکا دیا ہے کہ جواب صرف سکندر کی موت ہی سے ٹھنڈا ہو سکتا ہے۔ سلطان بابا نالکہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے کافی دیر تسلی دیتے رہے۔

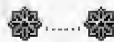
کچھ دیر بعد جب اس کی طبیعت ذرا سنبھلی تو وہ اندر کمرے سے ایک لفافہ اٹھالائی جسے اس نے سلطان بابا کے حوالے کر دیا۔ ”اس میں میری زندگی کی وہ تحریر ہے جو آپ کو سارا سچ بتا دے گی، میں نے سوچا تھا کہ میں اس ظالم کو یہ تب دکھاؤں گی جب اسے منگیس کس کر بے بسی کی حالت میں تختہ دار پر لا کھڑا کیا جائے گا، لیکن آپ کی آنکھوں پر پڑا پردہ اٹھانے کی خاطر میں یہ ابھی سے آپ کے حوالے کر رہی ہوں۔ پڑھنے کے بعد آپ خود اس لفافے کو اس سفاک شخص تک پہنچا دیجیے گا۔“ نالکہ اپنی بات ختم کر کے تیزی سے واپس اندر چلی گئی۔ سلطان بابا نے وہ لفافہ کھولا اور اس میں تیر کی ہوئی بند تحریر پر وہیں کھڑے کھڑے تیزی سے نظریں دوڑائیں، جیسے جیسے وہ خط پڑھتے گئے، ماتھے کی شکنوں میں اضافہ ہوتا گیا اور میں اور جیلر ویسے ہی اپنی جگہ کھڑے بے چینی سے پہلو بدلتے رہے۔ سلطان بابا نے تحریر ختم کرنے کے بعد خط کو دوبارہ تیر کے لفافے میں ڈال دیا اور گہری سانس لے کر بولے۔ ”جیلر صاحب! قیدی کی آخری خواہش کب پوری کریں گے آپ؟ میرا مطلب ہے ہماری اس سے آخری ملاقات کا وقت کیا طے کیا ہے آپ نے۔“ جیلر نے ہنسنے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”عام طور پر پچاسی کی آخری ملاقات کا وقت عصر کے بعد کا ہوتا ہے۔“ سلطان بابا نے برستے آسمان کی جانب نگاہ ڈالی، جو اس وقت اندر پھوٹ پھوٹ کر رونے والی نالکہ کی طرح بادلوں کا سارا پانی بہانے پر مصر لگتا تھا۔ ”نہیں، عصر کے بعد تو بہت دیر ہو جائے گی۔ ہم ابھی کچھ دیر بعد ظہر کی نماز پڑھ کر قیدی سے ملنے چلیں گے۔ آپ سارے انتظامات کروالیں۔“

بارش پوری رفتار سے شروع ہو چکی تھی اور جس وقت ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد میں اور سلطان بابا جیلر کی سربراہی میں سزائے موت کے قیدیوں کے مخصوص احاطے میں داخل ہو رہے تھے، تب تک سارا سینٹرل جیل ہی ایک بڑے تالاب کی سی صورت اختیار کر چکا تھا قیدی اپنی اپنی کال کوٹھڑیوں کی سلاخوں سے چپکے ہوئے کھڑے تھے، کیوں کہ پانی کچانسی گھاٹ کی کوٹھڑیوں میں داخل ہونے لگا تھا۔ قیدیوں کے چہرے کیا تھے، حسرت سے اٹے فریم تھے۔ ان کی نظریں ہمیں یوں ٹٹول رہی تھیں جیسے ہم کسی اور ہی دنیا کی مخلوق ہوں۔ جیلر نے سکندر کی کوٹھڑی کے سامنے جا کر اپنی اسٹک سے سلاخیں کھٹ کھٹائیں۔ ”سکندر، انھوں تم سے سلطان بابا ملنے کے لیے آئے ہیں۔“ سکندر جو کسی گہری سوچ میں غرق، کوٹھڑی کی چھت سے نچنے پانی سے نہچنے کے لیے ایک کونے میں دیوار کے ساتھ سکر کر بیٹھا تھا، سلطان بابا کا نام سن کر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کبوتر خانے کی مانند، چار بانی چھ کی یہ کوٹھی بس اتنی سی تھی کہ اگر کوئی لمبے قد کا قیدی، رات کو سوتے وقت ناٹکیں سیدھی کرنا چاہتا تو سلاخوں سے باہر برآمدے میں نکل آتیں۔ سکندر لپک کر سلاخوں کے قریب آ گیا۔ ”مجھے یقین تھا آپ انتہائی طویل فاصلے کے باوجود میری آخری خواہش پوری کرنے یہاں تک ضرور آئیں گے۔ میری زندگی تو اب صرف چند گھنٹوں کی مہمان ہے، لیکن آپ کا یہ احسان میری روح بھی تاباں نہیں بھولے گی۔“ سکندر کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ جیل کی شدید مشقت اور تکلیفوں نے بھی اس کے چہرے کی وجاہت پر کچھ زیادہ اثر نہیں ڈالا تھا۔ اس کی گہری کالی آنکھوں میں اب بھی خاصی چمک باقی تھی۔ سلطان بابا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”کہو نو جوان..... میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں۔ مجھے یا انہیں پڑتا کہ ہم پہلے بھی کبھی کہیں ملے

ہوں۔“ سکندر نے ان کا ہاتھ چوم کر تعظیم سے چھوڑ دیا۔ ”نہیں! آپ مجھ سے نہیں ملے، لیکن میری آپ سے ملاقات بہت پرانی ہے۔ آپ کو شاید یاد ہو، آج سے تین سال قبل ساحل کی درگاہ کے سامنے لنگر انداز بحری جہاز میں ایک بلاسٹ ہوا تھا۔ وہ بم دھماکا میں نے ہی کیا تھا۔ حالانکہ بحری جہاز تقریباً خالی تھا، لیکن اس میں بھرے خام مال کی وجہ سے دن رات اس کی نگرانی کی جاتی تھی۔ مجھے اس بلاسٹ کی تیاری کے لیے تقریباً تین ہفتے تک ایک زائر کا بھیس بدل کر آپ کی درگاہ ہی میں چھپنا پڑا تھا۔ ان تین ہفتوں میں بارہا عصر کی نماز کے بعد مجھے آپ کا درس سننے کا اتفاق ہوا۔ یقیناً جانیں، اگر میں اپنی زندگی کی راہ پہلے ہی متعین نہ کر چکا ہوتا تو ضرور ہمیشہ کے لیے اسی درگاہ ہی میں آپ کے قدموں کے پاس اپنا ڈیرہ ڈال دیتا، کیوں کہ آپ مجھے ایک سچے انسان دکھائی دیے تھے۔ ایک ایسا شخص جو بنا کسی فائدے کے اپنا سب کچھ تیاگ کر مجھ جیسے بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھا رہا ہے لیکن بلاسٹ کے فوراً بعد مجھے وہاں سے فرار ہونا پڑا، کیوں کہ پولیس نے سارے علاقے کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ البتہ میں نے اسی دن یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ زندگی میں ایک بار آپ سے ضرور ملوں گا اور آپ سے اپنے گناہوں کی معافی کی دعا کی التجا کروں گا۔ اب اسے مقدر کا ستم کہوں، یا اپنی خوش نصیبی کہ آپ سے تب ملاقات ہو رہی ہے جب میری رخصتی کا وقت قریب ہے اور مجھے واقعی آپ جیسے کسی بزرگ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔“ اتنے میں بڑے حوالدار نے پانی میں شراب اور دو سپاہیوں کے ساتھ آ کر جیلر اقبال کو مطلع کیا کہ جلاوطن بھیج گیا ہے۔ جیلر نے ان دو سپاہیوں کو وہیں نگرانی پر چھوڑا اور خود عجلت میں سلطان بابا سے اجازت لے کر پھانسی کے انتظامات کا جائزہ لینے چلا گیا۔ جلاوطن کی آمد کی خبر سن کر سکندر کے چہرے پر ایک عجیب سی درد بھری مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”چلیں اچھا ہوا، جیلر صاحب کی یہ پریشانی بھی ختم ہوئی۔ بہت پریشان تھے وہ اس جلاوطن کی غیر حاضری کی وجہ سے اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ اپنی زندگی میں تو میں کسی کو کوئی سکھ دے نہیں پایا اور اب جاتے جاتے بھی زمانے کو سوتا کر جا رہا ہوں۔“

سلطان بابا نے وہیں برآمدے ہی میں سکندر کی کوٹھڑی کے سامنے نشست ڈال لی تھی۔ انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور کچھ دیر میں دعا ختم کر کے سکندر پر پھونک کر بولے ”میں تمہیں تمہارے وہ اصول توڑنے پر مجبور نہیں کروں گا، جنہیں جھانے کی خاطر تم نے اپنی جان بھی داؤ پر لگا دی ہے، لیکن میری بات یاد رکھنا کہ سوائے شرک کے، ہر گناہ کا کوئی نہ کوئی کفارہ ضرور ہوتا ہے۔ اگر زندگی کے آخری پل میں بھی تمہیں یہ احساس ہو جائے کہ تم کسی گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوئے ہو تو کفارہ ادا کرنے کی کوشش ضرور کرنا۔ شاید وہی کفارہ تمہاری بخشش کا سبب بن جائے۔“ سکندر نے چونک کر ہم دونوں کی جانب دیکھا، لیکن نہ جانے کیا سوچ کر چپ ہو گیا۔ اتنے میں جیل کا ایک وارڈن لمبی سی خاکی برساتی پہنے وہاں آ پہنچا اور سکندر سے مخاطب ہوا۔ ”ہاں بھی قیدی نمبر ۳۱۸، تمہارا کوئی اپنا ہے، جو تمہاری خواہش کے مطابق کل تمہاری میت وصول کر سکے۔ اس کا نام، پتا کھواؤ، یا پھر ہم رفاه عامہ کے محکمے کو لکھ دیں۔“ وارڈن کا میکا کی انداز میں اس کا سوال سن کر سکندر ہنس پڑا۔ ”میرے تو سب سے قریبی اب تم ہی ہو کریم خان، کیوں نہ تمہارا ہی نام دے دوں؟“ کریم خان نے جلدی سے آسمان کی طرف دیکھ کر کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ”نہ بابا نہ، میں تو پہلے ہی موسم کے تیور دیکھ کر ڈر رہا ہوں۔“ سکندر نے دوبارہ اسے چھیڑا۔ ”فکر نہ کرو وارڈن صاحب، پھانسی بارش میں بھی دی جاسکتی ہے۔ ہاں، البتہ سنا ہے کہ لاش بھینگنے کے بعد بھاری بہت ہو جاتی ہے۔ اس لیے تم لوگوں کو میری بارات رخصت کرنے میں کافی دشواری پیش آئے گی۔“ سکندر کی بات سن کر وارڈن کریم مزید وہاں تک نہیں پایا، اٹنے قدموں دوڑ گیا۔ سکندر کچھ دیر تک اسے جاتا دیکھتا رہا، پھر اس نے سلطان بابا کو جواب دیا۔ ”آپ یقین کریں، میرا ضمیر

بالکل مطمئن ہے۔ میں نے آج تک صرف معاشرے کے ناسوروں کے خلاف ہی ہتھیار اٹھایا ہے، وہ جو اس ملک اور یہاں کے غریب عوام کا خون چوس رہے ہیں اور جنہیں جس قدر جلدی رخصت کر دیا جاتا، اسی قدر بہتر تھا۔ میں مانتا ہوں کہ ملکی قانون کی نظر میں یہ ایک بھیا تک جرم ہے اور اس کی جو سزا مقرر ہے وہ میں بھگت رہا ہوں، لیکن مجھے لگتا ہے کہ میں صرف اپنے حصے کا وہ کام کر کے جا رہا ہوں جو قدرت نے میرے ذمے لگایا تھا اور باقی کام میرے جانے کے بعد میرے ساتھی پورے کرتے رہیں گے۔“ اس موقع پر میں خاموش نہیں رہ سکا اور بول پڑا ”لیکن اس بات کا تعین کون کرتا ہے کہ معاشرے میں پلتا ہوا کون سا شخص کرپشن کی غلاظت میں رہتے رہتے ناسور بن چکا ہے اور اب اسے سزا دے کر رخصت کر دینے کا وقت آچکا ہے؟“ سکندر نے پہلی بار غور سے میری جانب دیکھا۔ شاید اسے سلطان بابا کی موجودگی میں ان کے ساتھ آنے کی خدمت گار سے ایسے کسی سوال کی توقع نہیں تھی۔ سلطان بابا سکندر کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ کر بولے۔ ”یہ عبداللہ ہے، اسے میرا ہی ایک حصہ سمجھو اور جو بھی کہنا چاہتے ہو، کھل کر بتاؤ، ہم دونوں راز کی حفاظت کرنا خوب جانتے ہیں۔“ سکندر کے چہرے پر اطمینان کی لہر آ گئی۔ ہمارا پورا ایک نیٹ ورک ہے۔ یہ ایک منظم تنظیم ہے جو ہر کیس کی مہینوں چھان بین کرتی ہے اور پھر سپریم کمانڈ سزا کا فیصلہ کرتی ہے۔ ہم بلاوجہ بے قصوروں پر گولیاں نہیں برساتے۔“ اب دوسرا سوال سلطان بابا نے کیا۔ ”جس نو جوان سائنس دان رؤف کے قتل کے الزام میں تمہیں پھانسی کی سزا سنائی گئی ہے، اس کا قصور کیا تھا؟“ سکندر نے نفرت سے ہونٹ سکڑے۔ وہ بھی اسی کرپٹ اور چور معاشرے کا ایک حصہ تھا، جس کی جڑیں کاٹنے کے لیے میں اور میری تنظیم سرگرم تھی۔ وہ بظاہر اس ملک کا وفادار تھا اور لاکھوں روپے تنخواہ کی مدد میں وصول کر رہا تھا۔ اس کے بیرونی دوروں اور عالمی کانفرنسوں میں شرکت کا خرچہ بھی ہماری غریب سرکار ہی اٹھاتی تھی، لیکن در پردہ وہ بھی ایک عیاش اور بے ایمان شخص تھا۔ میں نے خود آخری چار دن تک اس کی نگرانی تب کی تھی جب وہ ایک کانفرنس کے بہانے کسی عورت کے ہمراہ بھور بن کے ایک مہنگے سوٹ میں مقیم تھا۔ اس پر گولی چلانے سے قبل میں ہر طرح کا اطمینان کر چکا تھا۔ تب ہی میں نے اسے ختم کرنے کا فیصلہ کیا تھا، حالانکہ میری تنظیم کے بڑوں نے دو مہینے قبل ہی اس کے بوجھ سے معاشرے کو پاک کرنے کا فیصلہ کر کے مجھے آرڈرز پہنچا دیئے تھے۔“ سکندر کے لہجے کا یقین اور آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ اسے اپنے عمل پر ڈرا بھی بچھتاوا نہیں ہے۔ سلطان بابا نے چند لمحے توقف کیا اور بولے۔ ”نا ملکہ تمہاری کیا گتی ہے؟“ جانے یہ سوال تھا، یا کوئی ہم، جسے سنتے ہی سکندر کچھ اس زور سے اچھلا، جیسے اسے کسی نے ہزار وولٹ کرنٹ کا جھنکا دے دیا ہو۔ ”آپ..... آپ نا ملکہ کو کیسے جانتے ہیں؟“ سلطان بابا نے اصرار کیا۔ ”پہلے تم میرے سوال کا جواب دو۔ پھر میں بھی تمہیں تفصیل بتا دوں گا۔“ سکندر کچھ لمحے اپنے حواس مجتمع کرتا رہا، پھر کھوٹی کھوٹی آواز میں بولا۔ ”نا ملکہ کبھی میری روح کا حصہ تھی، میرا سب کچھ تھی۔ لیکن اب وہ میرے لیے ایک نامحرم، ایک اجنبی ہے۔“ سلطان بابا کچھ دیر تک سکندر کو غور سے دیکھتے رہے، پھر ان کی ذوقی ہوئی سی آواز سنائی دی ”تو گویا تم نہیں جانتے ہو کہ رؤف نامی جس نو جوان کو تم نے قتل کیا تھا، وہ اسی نا ملکہ کا شوہر تھا اور نا ملکہ آج تمہاری وجہ سے بیوہ کہلاتی ہے۔“



عصا اور دیمک

تو خواب دگر ہے تیری تدفین کہاں ہو؟
دل میں تو کسی اور کو دفنایا ہوا ہے
سانپوں میں عصا پھینک کے اب محو دعا ہوں
معلوم ہے دیمک نے اسے کھایا ہوا ہے

سلطان بابا کا انکشاف سن کر سکندر کا وہی حال ہوا، جو اپنے انتہائی عزیز کی موت کا سن کر کسی کا ہو سکتا ہے۔ وہ کچھ دیر تو سکتے میں بجا بیٹھا رہا اور پھر یکایک چلا کر کہنے لگا ”نہیں..... ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، نائلہ کے شوہر کا نام تو عمران ہے اور نائلہ نے انتہائی اچھے گھرانے کا رشتہ قبول کیا تھا۔ اگر میں آپ کو اتنے قریب سے نہ جانتا ہوتا تو ضرور یہ سمجھ لیتا کہ یہ بھی پولیس ہی کی کوئی گھٹیا چال ہے، مجھ سے راز اگلوانے کی۔“ سلطان بابا نے مزید کچھ کہے بنا اپنی جیب سے نائلہ کا دیا ہوا لفافہ نکالا اور سکندر کے حوالے کر دیا۔ ”ہو سکے تو اس تحریر کی سچائی کو جانچنے کی کوشش کرو۔ نائلہ کے شوہر کا پورا نام عمران رؤف تھا اور یہ وہی مقتول ہے، جس نے کیمیکل انجینئرنگ میں بیرون ملک سے ڈگری میں ٹاپ کر کے اپنے ملک کی خدمت کے جنون میں یہاں کے ایک تحقیقاتی ادارے میں بطور جونیئر سائنس دان نوکری قبول کی تھی۔ لیکن بد قسمتی سے اس ہونہار نوجوان کی قضا تمہارے ہاتھوں لکھی تھی۔“ سکندر نے چھپتے ہوئے لفافہ سلطان بابا کے ہاتھ سے لے لیا اور جیسے جیسے اس کی نظریں کاغذ پر لکھی تحریر پر پھیلی گئیں، ویسے ویسے اس کا جسم خشک ریت سے بنے گھر وندے کی طرح بکھرتا چلا گیا اور کچھ ہی دیر میں جب اس نے تحریر ختم کی تو تب تک وہ بالکل بے جان ہو چکا تھا۔ کہتے ہیں، موت زندگی سے رابطہ ٹوٹ جانے کے عمل کا نام ہے اور ضروری تو نہیں انسان کا زندگی سے رابطہ صرف سانس کی ڈور ٹوٹنے ہی سے منقطع ہو سکتا ہو، کچھ اموات ہم پر سانس لینے کے دوران بھی تو وارد ہو سکتی ہیں۔ ہم جیتے جی تو کئی بار مرتے ہیں۔ سکندر پر بھی اس وقت کچھ ایسی ہی موت طاری تھی اور اس کی اس سے بڑی بد قسمتی کیا ہو سکتی تھی کہ یہ موت اس پر تب طاری ہوئی، جب اس کی اصل موت میں صرف چند گھنٹے ہی باقی بچے تھے۔ اگر اسے آج یہ پتا نہ چلتا کہ وہ اپنی محبوبہ کے شوہر کا قاتل ہے تو تقدیر کا کیا بگڑ جاتا۔ کچھ بھرم زندگی سے بھی بڑے ہوتے ہیں اور انسان اپنی ساری زندگی میں کماتا ہی کیا ہے۔ یہی چند بھرم..... تو پھر اس شخص کی حالت کیا ہوگی، جس کی عمر بھر کی جمع پونجی، اس کا سب سے بڑا بھرم موت سے چند لمحے پہلے لٹ جائے۔

اسنے میں عصر کی اذان شروع ہو گئی۔ بارش نے کبھی نہ رکنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ جانے کیوں اس وقت مجھے حال ہی میں پڑھے گئے ناول ”خدا اور محبت“ کا ایک جملہ شدت سے یاد آیا کہ ”یہ بارشیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں، کبھی کبھی تو ساری عمر بھی برستی رہیں تو کسی کا اندر بھگنو نہیں پاتیں اور کبھی کسی کے من کو ہر لمحہ جل تھل کئے رکھتی ہیں، لیکن باہر والوں کو اس کی خبر بھی نہیں ہو پاتی۔“ سلطان بابا نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ سکندر ویسے ہی گم صم ساسلاخوں سے

سرٹکائے بیٹھا تھا۔ میں اور سلطان بابا عصر کی نماز پڑھنے کے بعد جیل کی جامع مسجد سے باہر نکلے تو گھنے کالے بادلوں کی وجہ سے اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ سلطان بابا اسکندر کی طرف چلے گا کہیں گے، لیکن میری توقعات کے برعکس ان کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ ”اب دل جلے تو تم سنبھالو ساحر میاں۔ میں ایک بار مقتول کی بیوہ سے مل کر اس کا دل موم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پتا نہیں کیوں، لیکن مجھے اب بھی اسکندر اپنی راہ سے بھٹکا ہوا ایک نوجوان لگتا ہے، جسے استعمال کیا گیا ہے۔“ بابا آپ مجھے سب کے سامنے عبداللہ، لیکن تنہائی میں ساحر بلاتے ہیں..... ایسا کیوں؟ وہ میرا سوال سن کر مسکرا دیئے۔ ”اس لیے کہ عبداللہ کے اندر موجود ساحر بھی میرے لیے اتنا ہی اہم ہے، جتنا کہ عبداللہ..... اور ساحر کے اندر کا عبداللہ تو پہلے ہی سے ہمارے ساتھ ہے۔ یاد رہے، نام بھی ہماری آدمی شناخت ہوتی ہے..... اور میرا مقصد کبھی تمہاری اصل شناخت ملانا نہیں رہا۔“ سلطان بابا میرا کا ندھا تھپک کر آگے بڑھ گئے اور میں یونہی سوچ میں ڈوبا، بھیگتا ہوا دوبارہ اسکندر کی کوشش کی کی جانب چلا آیا۔ اسکندر کے ہاتھوں میں اب بھی نائلہ کا دیا ہوا خط ویسے ہی تھا۔ ایک بہت ہی مضبوط اور اتنی اعصاب کا انسان جب ٹوٹتا ہے تو پھر ٹوٹا ہی چلا جاتا ہے۔ شاید ہم سب ہی بیک وقت اندر سے نولاد اور موم کے بنے ہوتے ہیں۔ نولاد کا ملمع جب اترتا ہے تو پھر موم کو کھینچنے زیادہ دیر نہیں لگتی۔ اسکندر کا موم چہرہ بھی پگھل پگھل کر آنسوؤں کے جوہر میں ڈوب سا گیا تھا۔ میں نے سلاخوں کے قریب جا کر کھنکھار کر اپنی جانب متوجہ کیا۔ اس نے پگھلتی نظریں اٹھائیں۔ ”کیا وہ یہیں ہے.....“ ”ہاں..... وہ جیل کے ریٹ ہاؤس میں ٹھہری ہوئی ہے۔“ اسکندر میری بات سن کر زخمی سی ہنسی ہنسا۔ ”اوہ..... تو میری پچاسی کا نظارہ دیکھنے کے لیے یہاں تک آئی ہے۔ یہ رشتے بھی پل پل میں کیسے کیسے بدلتے ہیں۔ کل تک جو مجھے آئی ایک کھروچ کی تکلیف سے رو رو کر آسان سر پر اٹھا لیتی تھی، آج وہ میرے بے جان وجود کو پچاسی کے پھندے پر چھوٹتے ہوئے دیکھنے کے لیے یہاں اس موت کی وادی میں بیٹھی میری سانسیں بند ہونے کا انتظار کر رہی ہے۔“ مجھے ایک بار پھر اس محبت نامی اٹھوڑھے کی سفاکی پر شدید غصہ آنے لگا۔ آخر اس عفریت کا پیٹ کب بھرے گا؟ کب تک یہ ہم معصوم انسانوں کی روح نگھٹا رہے گا۔ کب تک ہمارے جذبوں کی شہ رگ میں اپنے قاتل دانت گاڑھے ہمارا خون پیتا رہے گا؟ اس کے جان لیوا زہر کا ایک تازہ شکار اسکندر کی صورت میں اس وقت بھی میرے سامنے ادھرا موجد ہوا تھا۔

اسکندر کی کہانی بھی اپنی محبت کی ہزاروں لاکھوں کہانیوں میں سے ایک تھی۔ اس کی اور نائلہ کی ملاقات انٹرویوینرشی کے ایک تقریری مقابلے کے دوران ہوئی تھی۔ جب نائلہ کی زبردست تیاری اور تحقیق کے باوجود اسکندر نے مقابلے کا پہلا انعام جیت لیا تھا۔ نائلہ مقابلے کے ساتھ ساتھ اپنا دل بھی ہار کر گھر واپس لوٹی تھی۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ محبت صرف دور وحوں کے ملاپ ہی کا نام ہوتا، ہمارے معاشرے میں جذبوں کے سوداگر اس معصوم جذبے کو بھی سونے چاندی کے انباروں سے تولنے کا فن جانتے ہیں اور اسکندر کے پاس تو کبھی عام حالات میں بس کا پورا کرایہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس کی بیوہ ماں نے بچپن ہی سے دوسروں کے گھروں کے کپڑے اور برتن دھو کر اس کے سرکاری اسکولوں کی فیس بھری۔ لیکن نائلہ کے کروڑ پتی باپ سینڈھ امجد کو اپنی لادلی بیٹی کا دل اس کے پسندیدہ کھلونوں سے جوڑنا آتا تھا، تو وہ ان کھلونوں سے اس کا من پھیرنا بھی خوب جانتا تھا اور اسے اپنی حد سے زیادہ غلڑی ہوئی بیٹی کی ”تریاہٹ“ کا بھی بہت اچھی طرح سے اندازہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے غریب پچھڑ نوجوان کو براہ راست دھکے مار کر اپنے محل سے نکالا تو اس کی ضدی بیٹی بھی اس کے ساتھ ہی سب کچھ ٹھکرا کر در در کی ٹھوکریں کھانے کے لیے نکل جائے گی، اس لیے اس نے بڑی مہارت سے سارے معاملے کو سنبھال لیا۔ بیٹی کی پسند کو اس نے ایک بہترین اداکار کی طرح آنکھوں میں آنسو بھر کر قبول کیا اور اسکندر کی

انار پھیلی ضرب اس نے پہلے ہی روز اس وقت لگائی، جب اس نے اپنے دفتر کی سیٹ اور سارا کاروبار سکندر کے حوالے کرنے کا عندیہ ظاہر کیا۔ اس کی توقع کے عین مطابق سکندر نے اپنی ہونے والی مگنیر نائلہ کے سامنے ہی سیٹھا امجد کی یہ پیش کش ٹھکرا دی کہ وہ نائلہ کو اپنے ہاتھوں سے کما کر کھلائے گا۔ سیٹھا امجد یہ بات بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ سکندر جیسے غریب، لیکن آئیڈیلٹ نو جوان جب تک اپنے خوابوں کی دنیا سے باہر نکلتے ہیں، تب تک ان کے پاس کسی آفس میں بڑا، یا چھوٹا باؤبن کرکڑی کرنے، یا پھر کسی ڈپارٹمنٹل سنسور پر شام کو پارٹ ٹائم سیزمین شپ کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔ لیکن ہزار تجربوں کے بعد بھی ایسے احق سدھرتے ہیں، نہ سدھر پائیں گے۔ دوسرا دار نائلہ کے باپ نے نائلہ کے چائے لانے کے لیے اٹھ جانے کے فوراً بعد لگیا۔ جب اس نے باتوں باتوں میں سکندر کو نائلہ کے ایک دن کے خرچ کے بارے میں بتایا، جو سکندر کے مہینوں کے خرچے کے برابر تھا۔ جب تک نائلہ چائے لے کر آئی تب تک سیٹھا امجد سکندر کو یہ بات بہت اچھی طرح سمجھا چکا تھا کہ اس کی ناز و نعم میں پلی نازک بنی کو پانے کے لیے سکندر کو صرف اپنے خوب صورت الفاظ سے بنے محل تراشا چھوڑ کر کوئی عملی قدم بھی اٹھانا ہوگا اور پھر جب سکندر نے خود امجد کو یہ بتایا کہ اس کا ارادہ پہلے ہی سے اس سال کے آخر میں ہونے والے مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے کا ہے اور اسے قوی امید ہے کہ وہ سی ایس ایس کا معرکہ سر کرنے کے بعد سرخرو ہو کر نائلہ کو اس کے معیار کے مطابق نہ سہی، لیکن ایک قابل عزت جیون کا سکھ دینے کے قابل ضرور ہو جائے گا، تب ہی وہ نائلہ کی رخصتی کی درخواست لے کر سیٹھا امجد کے در پر دستک دے گا۔ یہ سن کر امجد نے گہری سکھ بھری سانس لی، کیوں کہ فی الحال مصیبت خود اپنی مرضی سے سات آٹھ مہینے کے لیے ٹل رہی تھی اور یہ آٹھ مہینے اس کے لیے بہت تھے، اس نے دھیرے دھیرے اپنی بیٹی کو یہ احساس دلانا شروع کر دیا کہ زندگی صرف جذباتی وعدوں، خوب صورت باتوں اور مستقبل کے سپنوں کا نام نہیں ہے، اس لیے اسے سکندر کی ”راہ نمائی“ کرتے رہنا چاہئے کہ زندگی میں ترقی کرنا کس قدر ضروری ہوتا ہے۔ سکندر نے مقابلے کے امتحان میں کامیابی کے لیے دن رات ایک کر رکھے تھے، ایسے میں اچانک جب نائلہ اسے اپنے باپ کے بتائے ہوئے رستے پر چلنے کے مشورے دینے کے لیے چلی آئی تو کبھی کبھار سکندر بے حد چڑچڑاتا تھا اور یوں رفتہ رفتہ دونوں کے درمیان ہلکی پھلکی جھڑپوں کی صورت میں ”رنجش“ نے ڈیرے ڈالنا شروع کر دیئے۔ شومنی قسمت، سکندر مقابلے کے امتحان کے انٹرویو میں فیل ہو گیا۔ سیٹھا امجد کو اپنا آخری اور سب سے کاری وار کرنے کا موقع مل گیا اور اس نے ہمدردی کی آڑ میں اپنی بیٹی کو خوب سمجھا کر سکندر کے پاس بھیجا کہ سکندر نے آج تک اپنی سعی جو کر لی تھی، وہ کر کے دیکھ لی، لہذا بہتر یہی ہے کہ اپنی ضد چھوڑ کر سیٹھا امجد کا کاروبار سنبھال لے اور یہ وہ ماں کو لے کر سیٹھا امجد کے بنگلے ہی میں شفٹ ہو جائے۔ امتحان میں ناکامی کا صدمہ دل پر لیے بیٹھے سکندر کو اس لمحے گھر دامادی کا یہ طعنہ کسی گالی کی طرح لگا اور وہ بھڑک کر نائلہ پر برس پڑا۔ نائلہ بھی خود کو ترکی بہ ترکی جواب دینے سے روک نہیں پائی اور باقی کام سیٹھا امجد کی جلتی پرتیل جھڑکنے کے پالیسی نے کر دیا۔ تیسرے ہفتے کے ختم ہونے سے پہلے ہی سکندر اور نائلہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ اب دونوں کا مزید ساتھ چلنا ممکن نہ ہوگا اور پھر آخر کار وہ ”آخری الوداع“ بھی آپہنچا، جو شاید ایسے ہر محبت کرنے والے جوڑے کا ازل سے مقدر ٹھہرتا ہے۔ پھر سے وہی انا کی دیواریں، پھر سے وہی معصوم تحائف کی والہیسی۔ آخر یہ محبت کرنے والے جب چھڑنے لگتے ہیں، تو ایسی آخری ملاقات کا اہتمام ہی کیوں کرتے ہیں، جس میں وہ اپنی رہی سہی نازک اور خوب صورت یادوں کو بھی لوٹا آتے ہیں اور جدا ہونے والوں کی نشانیاں بھی کتنی ایک جیسی ہوتی ہیں۔ وہی خوشبو میں بے لگانی خط، چند خشک

پھول..... ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے چند ٹکڑے، خزاں کی کسی سردشام میں ایک ساتھ پی گئی کافی کا کوئی بل..... خالی سینما کے سب سے پچھلے ٹال میں اکٹھے بیٹھ کر دیکھی گئی انتہائی فلاپ فلم کے دو ٹکٹ..... پہلے ساون کی پہلی بارش میں بھیگ کر بچنے کے لیے جائے پناہ کی تلاش میں دوڑتے وقت ٹوٹ جانے والے سینڈل کا ایک فیٹہ..... نالکھ کے پاس بھی اس آخری ملاقات کے لیے چند ایسی ہی سوغاتیں تھیں، جو وہ سکندر کو لوٹانے کے لیے آئی تھی۔ سنہرے رنگ کا ایک ٹوٹا کف لٹک، ایک پرانا پارکر بن، چند پرانے ٹشو پیپر، جو سکندر نے پکڑوں پر چائے کرنے کے بعد استعمال کر کے پھینک دیئے تھے۔ سکندر کے استعمال شدہ پرفیوم کی آدھی بوتل، خزاں رسیدہ چند پتے اور سکندر کی اخبار میں چھپی چند نظمیں..... بس وہی کل اعلا شہ تھا، ان دونوں کی تین سالہ محبت کا..... جنہیں لوٹاتے وقت ایک ایسا لمحہ بھی آیا، جب دونوں کی ہی پلکیں بھیگ چکی تھیں اور قریب تھا کہ دونوں ہی جذبات کی رو میں بہہ کر اس کمزور لمبے کی گرفت میں آجاتے..... سیٹھ امجد اچھی طرح یہ بات جانتا تھا کہ ایسی آخری ملاقاتیں کبھی کبھی تجدید محبت کی بنیاد بھی بن جاتی ہیں، لہذا اس نے پورا انتظام کر رکھا تھا اور وہ خود بھی اس ریسٹورنٹ کی چلی منزل میں موجود تھا، جہاں اوپر سکندر اور نالکھ آخری بار مل رہے تھے۔ اس کے ہر کارے ان دونوں کے آس پاس ہی موجود تھے، لہذا جیسے ہی سیٹھ امجد کو خبر ملی کہ دونوں اب اس سوڑ پر ہیں، جہاں یادوں کا بہاؤ انہیں بہا کر لے جاسکتا ہے تو اس نے فوراً نالکھ کے موبائل پر کال کر کے اسے واپس حقیقت کی دنیا میں پہنچا دیا۔ نالکھ ٹوٹے دل کے ساتھ وہاں سے اٹھ آئی اور سکندر کے اندر جلتی آگ نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا۔

مرحلے کی ایک تنظیم کے لیڈر نے اسے بڑے لیڈر سے ملوایا، جس نے سکندر کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے اس لاوے کا رخ ان لوگوں کی جانب کر دے، جو معاشرے میں ایسی بے انصافیوں کے مرتکب ہو رہے ہیں، جیسی سکندر کے ساتھ ہی ایس ایس کے امتحان میں ہو چکی ہے۔ خرچے کی وہ پروا نہ کرے، کیوں کہ آج سے اس کی اور اس کی ماں کی ذمہ داری تنظیم کی ہے۔ یوں سکندر نے اپنی زندگی کا پہلا جرم اس رات کیا، جب اس نے پہلی مرتبہ تنظیم والوں کے ساتھ مل کر اخبار والوں کا ایک دفتر جلا دیا۔ کہتے ہیں کہ ماچس سے چراغ بھی جلائے جاسکتے ہیں آشیانے بھی، لیکن سکندر کے گھر پولیس کا پہلا چھاپہ پڑا اور اس کی ماں کو پتا چلا کہ اس کے گھر کو خود اسی کے گھر کے چراغ سے آگ لگ چکی ہے تو وہ پہلا صدمہ ہی برداشت نہیں کر پائی اور دل کا ایک ہی دورہ اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ تب سے سکندر کا ہر بڑھتا قدم اسے جرائم کی دلدل میں دھکیلتا چلتا گیا اور پولیس کی یہ حسرت ہی رہی کہ وہ کبھی رینگے ہاتھوں سکندر کو گرفتار کر سکے۔ سکندر کی پہلی اور آخری گرفتاری میں بھی پولیس کی کوشش سے زیادہ سکندر کی بد قسمتی کا عمل دخل تھا۔ نہ سکندر کی جیب عین چوراہے پر عادی تھی اور نہ ہی قریب سے گزرتی موبائل پولیس کی نظر جام ٹریفک کے ہجوم میں پھنسے سکندر پر پڑتی۔ اس سے آگے کی کہانی بہت مختصر تھی۔ سکندر کو گرفتاری کی رات ہی خصوصی تفتیش کے سبل میں منتقل کر دیا گیا اور تین مہینے کی مختصر مقدمے بازی کے بعد اسے پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ تب سے لے کر آج کی اس برسی شام تک سکندر اس پھانسی کی کوٹھڑی میں بیٹھا، اپنے اجل کے فرشتے کا انتظار کر رہا تھا۔ سکندر کی کہانی ختم ہوئی تو ہم دونوں بہت دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ پھر یکایک سکندر نے سلاخوں سے اپنے ہاتھ بڑھا کر میرے ہاتھ تھام لئے۔ ”ایک مرتبے ہوئے شخص کی ایک آخری تمنا پوری کرو گے.....؟ میں جانے سے پہلے ایک مرتبہ اس سے ملنا چاہتا ہوں، صرف اسے یہ یقین دلانے کے لیے کہ مجھ سے جو کچھ بھی ہوا، انجانے میں ہوا۔ میں اس پولیس آفیسر کو اپنا آخری بیان بھی ریکارڈ کروانا چاہتا ہوں، کیوں کہ اب بھی بہت سے

بھٹکے ہوئے نوجوان اس تنظیم کے آلہ کار ہیں..... شاید میرا بیان ان میں سے ایک کی نجات کا باعث بن جائے..... جلدی کرو..... میرے پاس وقت بہت کم ہے۔“

جس وقت راحیل صاحب کچھڑ میں لت پت اپنے جیل کے عملے سمیت بارش میں بھیگتے ہوئے جیل کوٹھڑی کے احاطے میں داخل ہوئے، تب رات پوری طرح ڈھل چکی تھی۔ موسم بٹیوں کی روشنی میں سکندر کا دو گھنٹے کا طویل بیان ریکارڈ کرنے میں جانے کتنے کورے صفوں کا مقدر سیاہ ہو گیا اور جب بیان مکمل ہونے کے بعد راحیل صاحب چلا چلا کر جیل کے وائرلیس سیٹ سے مختلف چوکیوں کو دہشت گردوں کے ٹھکانوں پر چھاپے مارنے کے احکامات آگے بڑھا رہے تھے، اس وقت رات کے دو بج چکے تھے، سکندر کی چھانسی میں صرف دو گھنٹے ہی باقی تھے، لیکن نائلہ نے سکندر سے ملاقات کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اب سکندر سے اس کی ملاقات چھانسی گھاٹ پر ہی ہوگی۔ راحیل صاحب نے اسے سمجھانے کی بے حد کوشش کی، حتیٰ کہ سکندر کے کفارے کے طور پر اس کا دیا گیا آخری بیان بھی نائلہ کو دکھا دیا کہ کس طرح اس کی تنظیم نے دھوکے سے محبت وطن عناصر کو سکندر کے ذریعے اپنے راستے سے ہٹایا، جن میں نائلہ کا شوہر بھی شامل تھا، لیکن نائلہ کے پتھر دل کو پچھلنا تھا، نہ پگھلا۔ آخر کار سلطان بابا کے اشارے پر مجھے اس نازنین دل گرفتہ کے در پر آدھی رات کو دستک دینی پڑی، اس کی سوچی ہوئی سرخ آنکھیں اس بات کی غمازی کر رہی تھیں کہ وہ گزشتہ رات سے روتی رہی ہے۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی تنگی سے کہا۔ ”تو اب آپ آئے ہیں، اس قاتل کی صفائی پیش کرنے کے لئے۔ مجھے حیرت ہے کہ پوری جیل ہی اس کی جان بخشی کے لیے کیوں دوڑی چلی آرہی ہے۔ ویسے اسے یقین تو ہمیشہ سے بہت کمال سے آتا ہے، اپنی باتوں سے اس نے سب کو بھی زیر کر ہی لیا، یا پھر کوئی نئی بولی دے دی ہے۔ اس کی نام نہاد تنظیم نے آپ کو بھی.....“ میں نے خاموشی سے اس کے طرک کا وار برداشت کیا۔ ”میں آپ کے پاس کوئی رحم کی اپیل لے کر نہیں آیا۔ دنیا میں مری ہوئی محبت سے زیادہ مردہ اور کوئی چیز نہیں ہوتی اور اس سے بھی زیادہ مرے ہوئے وہ لوگ ہوتے ہیں، جو اس مردہ محبت کا جنازہ اپنے وجود کے اندر دفنائے زندہ لوگوں کے درمیان چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ میری نظر میں آپ اور سکندر بھی ایسے ہی دوسرے ہوئے جسم ہیں، جو دنیا کے دکھاوے کے لیے اب تک سانس لے رہے ہیں۔ سچ پوچھیں تو سکندر اس معاملے میں آپ سے زیادہ خوش نصیب دکھائی دیتا ہے۔ کیوں کہ کچھ لمحوں کے بعد کم از کم وہ اس سانس لینے کی منافقت سے تو چھوٹ جائے گا۔“ نائلہ حیرت سے لنگ میری بات سن رہی تھی۔ میں جانے کے لیے پلٹا تو اس کی ٹوٹی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ ”ٹھہریں..... میں تیار ہوں..... آپ جیلر صاحب کو مطلع کر دیں۔“ کچھ ہی دیر میں جیل کی فہا سیٹیوں کی آواز سے گونج اٹھی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ قیدی کی آخری ملاقات شروع ہو چکی ہے۔ جانے سکندر، نائلہ کی ملاقات کیا رنگ لائے گی۔ میں یہی سوچتا ہوا فجر کی نماز کے بعد مسجد سے نکل کر گھاٹ پہنچا تو سکندر کی کال کوٹھڑی کے سامنے میلہ سا لگا ہوا تھا۔ جیلر اقبال سمیت جیل کا ڈاکٹر اور محضرٹ صاحب بھی آچکے تھے۔ سکندر اپنا آخری غسل لے کر تیسویں سپارے کی تلاوت ختم کر چکا تھا۔ تمام چھانسی گھاٹ کی کوٹھڑیوں کے چراغ جل چکے تھے اور سکندر کے آس پاس کے سبھی قیدی اپنے ایک دیرینہ ساتھی کو آخری الوداع کرنے کے لیے اپنی اپنی کوٹھڑی کی سلاخوں سے سر نکاتے، آنکھوں میں آنسو لیے کھڑے تھے۔ سکندر کی خواہش پر سلطان بابا بھی سکندر کے اس چند قدم کے آخری سفر میں اس کے ساتھ قدم ملانے کے لیے موجود تھے۔ سکندر نے قرآن پاک واپس چل پر رکھ دیا اور فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد ہمارے

ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ڈاکٹر نے اس دوران سکندر کا آخری طبی معائنہ کیا اور سکندر کو پیش کش کی کہ اگر وہ پچاسی گھاٹ تک چل کر جانے میں کچھ وقت محسوس کر رہا ہو تو اُس کے لیے اسٹریچر کا بندوبست کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس نے ڈاکٹر کی یہ پیش کش ٹھکرا دی۔ جیسے ہی سکندر نے کال کوٹھڑی سے باہر قدم رکھا، فضا میں آس پاس کے قیدیوں کے نعرے گونج اٹھے۔ ایک بولا، کلمہ شہادت..... سب بیک زبان بولے..... اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰہ..... سکندر کے قدم زمین پر تو پڑ رہے تھے، مگر وہ خود مجھے اس وقت کسی اور ہی دنیا کا باشندہ لگ رہا تھا۔ سلطان بابا کے سامنے پہنچ کر وہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رکھ پایا اور رو پڑا۔ ”بابا..... میرے اس آخری سجدے کی قبولیت کی دعا کیجئے گا..... میں نے اپنی ساری زندگی غیروں کے سامنے ماتھا کیئے میں گنوا دی..... یہ آخری چند لمحے ہی میری کمائی ہیں..... اور میری یہ چند ٹکوں کی کمائی بھی اب آپ کی نذر ہے۔“ سلطان بابا نے سکندر کو گلے لگایا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اگلے قدم پر میں کھڑا تھا۔ سکندر کی آنکھیں میری آنکھوں میں جیسے گڑی گئی۔ میں جانتا تھا کہ وہ میری آنکھوں میں کس کی شبیہ تلاش کر رہا تھا۔ کاش میری آنکھوں کو چند لمحے کے لیے ہی سہی، پر قدرت اتنی صلاحیت تو دے دیتی کہ میں اس سیاہ نصیب کے لیے اس گل رخ کا چہرہ اپنی آنکھوں میں سمجھاتا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر سکندر کی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ وہاں جا کر کسی مقام پر رک سکوں تو میرا انتظار کرنا..... ابھی میں نے تمہیں اپنی کہانی نہیں سنائی..... میرا یہ قرض تم پر ابھی باقی ہے۔“ سکندر میری بات سن کر ہلکے سے مسکرایا اور گلے لگا کر آگے بڑھ گیا۔ سب قیدی سلاخوں سے ہاتھ نکال نکال کر سکندر کو چھو کر اسے ”الوداع“ کہتے ہوئے رو رہے تھے۔ نیا جلا دگھاٹ کے باقی عملے کے ساتھ ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ سکندر کو تختے پر چڑھا دیا گیا۔ جلاوٹے کا لے رنگ کا غلاف نما کپڑا سکندر کے چہرے پر چڑھانے کی کوشش کی، لیکن اس نے ایک ہاتھ سے اسے کچھ لمحے رکنے کا اشارہ کیا۔ نالکہ ابھی تک گھاٹ پر نہیں لائی گئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد راجیل صاحب اسے لیے ہوئے پچاسی گھاٹ کے احاطے میں داخل ہوئے۔ نالکہ کی نظر اوپر اٹھی اور سکندر کی اپنی جانب گڑی ہوئی نظر سے ملی۔ میں نے اس درد اور بھٹکے موسم میں بھی اس نظر کے ٹکراؤ سے چنگاریاں ہی نکلتی ہوئی دیکھیں۔ سزائے موت کی کال کوٹھڑیاں، جن کی پشت پر یہ پچاسی گھاٹ موجود تھا، وہاں سے کسی قیدی نے زور کی تان لگائی۔

”من عاصم، من عاجز، من بے کسم..... تاجدار حرم..... ہونگا کرم..... ہم غریبوں کے دن بھی سنور جائیں گے.....“ بادل زور سے گرجا، بارش کی بوچھاڑ نے ہم سب کے جسم پوری طرح بھگو دیے۔ ہماری آنکھیں تو پہلے ہی بہہ رہی تھیں۔ جلاوٹے کا غلاف سکندر کے چہرے پر چڑھا دیا اور سکندر کو کاندھے سے پکڑ کر بند تختے کے درمیان میں لاکھڑا کیا۔ اس کے ہاتھ پہلے ہی پیچھے باندھ دیے گئے تھے۔ کال کوٹھڑیوں کی جانب سے ”اللہ ہو، اللہ ہو“ کی صداؤں نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ وہ پچاسی گھاٹ کی اونچی دیواروں کی وجہ سے اپنے ساتھی کو سانسیں ہارتے دیکھ تو نہیں سکتے تھے۔ لیکن ان میں سے کئی ایسے تھے، جنہوں نے اس سے پہلے بھی اپنے کسی ساتھی کو پیروں پر چل کر موت کی اس واوی میں جاتے اور پھر چار کاندھوں پر سوار واپس آتے ہوئے دیکھا تھا، لہذا انہیں ہر لمحے کی ترتیب کا خوب اندازہ تھا کہ ٹھیک کس لمحے جلاوٹے کے ہاتھ لیور کی جانب بڑھیں گے اور کب لیور کے کھٹکے سے وہ موت کی چیخ بلند ہوگی۔ لہذا وہ اسی ترتیب سے باواز بلند دعائیں دہرا رہے تھے۔ پھر وہی موت..... اور پھر وہی مذہب..... جلاوٹے کے مجسٹریٹ کی جانب دیکھا، جو اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی سوئیاں گن رہا تھا۔ مجسٹریٹ نے نالکہ سے دیر سے کچھ پوچھا، لیکن نالکہ نے انکار میں سر ہلادیا۔ مجسٹریٹ نے جلاوٹے کا اشارہ کیا۔ جلاوٹے لیور پر ہاتھ رکھا اور اپنی قوت مجتمع کی۔ سلطان بابا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ان کے ہاتھ میں

پکڑی تسبیح تیزی سے گھومنے لگی۔ جلاد نے نائلہ کی جانب رحم طلب نظر ڈالی۔ مجسٹریٹ کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا، نائلہ کا جسم تیزی سے لرز نے لگا۔ تیز ہوا نے بارش کی برچھی جیسی بوندوں کا رخ ہماری جانب کر دیا۔ مجسٹریٹ نے پانچ انگلیاں اٹھا کر جلاد کو پانچ سیکنڈ گننے کا اشارہ دیا۔ جیلر اقبال کے ہونٹوں پر کلمے کا ورد مزید بلند ہو گیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ قیدیوں کے نعرے چیخوں میں بدلنے لگے۔ اللہ ہو..... اللہ ہو..... اللہ ہو..... مجسٹریٹ کی پہلی انگلی بند ہوئی..... پانچ..... چار..... تین..... دو..... ایک..... جلاد نے زور سے لیور کھینچا..... فضا میں سخت کھلنے کی چٹکھا ڈگونی..... کھڑک..... سکندر کا جسم فضا میں پہلے اپنے بوجھ سے تیزی سے نیچے کی جانب گرا اور پھر سفاک پھندے کی بندش نے اس کی گردن کو جکڑ لیا۔ ٹھک کی آواز آئی اور سکندر چند لمحوں پہلے تڑپنے کے بعد ساکت ہو گیا۔ ٹھیک اسی لمحے ایک اور کھٹکا ہوا اور نائلہ کا جسم بھد سے زمین پر کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گر گیا۔ ڈاکٹر اور جیلر تیزی سے نائلہ کی جانب بھاگے۔ ڈاکٹر نے فوراً نبض دیکھی اور پھر جلدی سے نائلہ کی شرگ پر اپنے ہاتھ کی پشت رکھی، جو برف کی طرح سرد ہو چکی تھی۔ نائلہ کی روح بھی سکندر کے ساتھ ہی پرواز کر گئی تھی۔ سلطان بابا کی آنکھ سے آنسو ٹپکا اور نائلہ کی بند مٹی پر گرا، جہاں کاغذ کی ایک مڑی تری سی پرچی دبی بارش سے بھیگ رہی تھی۔ سلطان بابا نے کاغذ کی تھکول کر اسے پڑھا اور پھر اسے میری جانب بڑھا دیا۔ شاید یہ تمہارے لیے ہے.....“

میں نے جلدی سے کاغذ کی تحریر پر نظر دوڑائی۔ ”آپ نے ٹھیک ہی کہا تھا..... ہم دونوں ہی بہت پہلے مر چکے تھے، اب صرف شرط اس منافقت سے پہلے جان چھڑانے کی ہے، جو ان سانسوں کی صورت میں ہمیں شرمندہ کر رہی ہیں۔ میں جان چکی ہوں کہ سکندر رؤف کے قتل میں استعمال کیا گیا ہے اور میں نے دل سے اسے معاف بھی کر دیا، لیکن اس کی تنظیم، اس بیان کے بعد اسے کبھی معاف نہیں کرے گی۔ میرے لیے سکندر بہت پہلے مر چکا ہے اور میں ایک بار پھر اسے ان لوگوں کے ہاتھ سے مرنا ہوا نہیں دیکھ سکتی اور وہ خود بھی یہی چاہتا ہے کہ اس کے پچھلے تمام گناہوں کا کفارہ آج یہیں ادا ہو جائے اور وہ سرخرو ہو کر آگے جاسکے۔ میرے لیے دعا کیجئے گا کہ میں بھی زندہ رہنے کی اس منافقت سے جلد از جلد چھٹکارا پاؤں۔“ میں نے نائلہ کی تحریر اپنی مٹی میں جکڑ لی۔ اسے ہماری کسی دعا کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ بھی سکندر کے ساتھ اپنے آخری سفر پر روانہ ہو چکی تھی۔

